کتاب و سنت اور اسلافِ امت کی تعلیمات کا علمبردار

ماہنامہ

اشرف الجرائد
حیدرآباد

Volume:17 Issue:8 August 2024

مدیر

مولانا محمد عبدالقوی

ادارہ اشرف العلوم ٹرسٹ حیدرآباد

www.iauth.in

اشرف الجرائد میں شامل تمام مضامین کی تمام جزئیات سے مدیر کا اتفاق ضروری نہیں

آئینۂ مضامین

اشرف الجرائد کی توسیع واشاعت میں حصہ لے کر اشاعتِ دین کا ثواب حاصل فرمائیں۔ ادارہ



درسِ قرآن

دین کی بنیاد اعتقادات پر ہے

از: مولانا محمد عبد القادر فرید قاسمی*

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ﴿١١﴾ وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿١٢﴾

(الزمر:۱۱)

ترجمہ: کہہ دو کہ مجھے تو حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی اس طرح عبادت کروں کہ میری بندگی خالص اسی کے لئے ہو۔ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلا فرماں بردار میں بنوں۔

توضیح: خدا تعالیٰ کی طرف سے انسانیت کے لیے جن قوانین و احکامات کا نزول ہوا ہے اس کو ''شرع'' کہا جاتا ہے، شرع کا لغوی معنی وہ سیدھا راستہ جو واضح ہو اور اس کا اصطلاحی معنی ''ما سن اللہ من الدین للعباد و امر بہ'' بندوں کے زندگی گزارنے کا وہ طریقہ جسے اللہ نے تجویز کیا ہو اور بندوں کو اس پر چلنے کا پابند بنایا ہو۔

چنانچہ علماء کرام نے شریعت کے پانچ اجزاء بتلائے ہیں: (۱) عقائد (۲) اعمال (۳) اخلاقیات (٤) معاشرت اور (٥) معاملات۔

اگر غور کیا جائے تو سارے دین کا دارومدار عقائد پر موقوف ہے، جب عقائد درست اور مضبوط ہوں گے تو اعمال بھی قبول ہوں گے، دعائیں بھی سنی جائیں گی، اور اگر عقائد مضبوط نہیں ہوں گے تو اعمال کے محل اور عبادات کی تعمیرات تباہ و برباد اور ضائع ہو جائیں گی۔

اب سوال یہ ہے کہ عقیدہ کسے کہتے ہیں عقیدہ کا لغوی معنی ہے ''ما عقد علیه القلب و الضمیر'' وہ بات جس کا قلب و ضمیر کو پابند بنا دیا جائے۔ اصطلاح میں ''دین کی اس بات یا خبر کو کہتے ہیں جو دل میں اتنی مضبوطی سے بیٹھے کہ اب اس کے خلاف کرنا یا سننا گوارا نہ کیا جائے''۔ جیسے وحدانیت باری تعالیٰ، رسالت و

* ذمہ دار ادارہ حسیب المدارس، گھٹکیسر

نبوت، حشر ونشر، برزخ ودوزخ، میزان وکرسی، اور جنت وجہنم ہیں: چنانچہ توحید باری تعالیٰ ہی کو لے لیں کوئی مسلمان اگر اس کا ایمان سلامت ہے تو توحید پر کوئی سمجھوتہ نہیں کرسکتا، صحابہ کرامؓ نے اس عقیدہ کو اپنایا، اور اپنے کردار سے بھی امت پر یہ واضح کردیا کہ ہر حال میں ''احد'' ہی کا نعرہ ہوگا، جس طرح ہمارا عقیدہ ذاتِ باری تعالیٰ کے ایک ہونے کا ہے، ایسے ہی ہمارا عقیدہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنی صفات میں تنہا وبے مثل ہے، کوئی اس کا ساجھی، سہیم، اور شریک نہیں ہے، ہمارا عقیدہ ہے کہ خدا تعالیٰ ہی رزق دینے والے، عزت وذلت کے مالک، لیل ونہار اور شمس وقمر کے خالق، زندگی اور موت دینے والے، اور اپنی قدرت میں بھرپور، بے مثل وبے مثیل ہیں اور مشکل کشا، فریادرس بھی وہی ہے، بہت سے ہمارے بھائی عقیدہ کی کمزوری کے سبب کسی کو داتا، کسی کو مُشکل کشا، کسی کو حاجت روا، نہ جانے کیسے کیسے خیالات کے بھنور، توہمات کے گرداب، رسومات کے بھول بھلیوں میں گم ہوجاتے ہیں، نتیجتاً ایمان کا خرابہ اور اعمال صالحہ کا ضیاع ہوجاتا ہے۔

خصوصاً ماہِ صفر کے حوالے سے ہمارے مسلم معاشرے میں کس قدر توہمات، فرسودہ خیالات، بے سند رسومات پائے جاتے ہیں، اس ماہ ہی کو منحوس سمجھا جاتا ہے، بدشگونی لی جاتی ہے، یہ ایسے ہی ہے جیسے قوم موسیٰ نے بدشگونی کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے اصحاب کی طرف منسوب کردیا تھا، اور بنی اسرائیل نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں پر بھی نحوست کی تہمت لگائی تھی، اور اچھائی کو اپنا کمال استحقاق سمجھ لیا تھا، لیکن اپنے اعمالِ بد کی طرف کوئی توجہ نہیں تھی۔

لہٰذا صفر سے متعلق بے ہودہ خیالات، معاشرے میں پائی جانے والی شرکیہ رسومات، اغیار کی جانب سے درآئی توہمات یہ ہمارے عقیدے کی کمزوری کی علامت ہیں، عقیدہ پختہ ہوگا تو ایمان معتبر ہوگا، ایمان معتبر ہوگا تو عبادات قابل قبول ہوں گی اسی اعتقاد اور فکری پختگی کے سبب گمراہیوں کے دلدل سے محفوظ رہ پائیں گے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَسۡئَلُکَ لَذَّۃَ النَّظۡرِ اِلیٰ وَجۡھِکَ وَالشَّوۡقَ اِلیٰ لِقَائِکَ فِیۡ غِیۡرِ ضراءِ مَضَرَّۃٍ وَلَا فِتۡنَۃً مُضِلَّۃً



درسِ حدیث

مؤمن الفت ومحبت کا مرکز ہوتا ہے

از: مولانا مفتی محمد احمد علی قاسمی*

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: اَلْمُؤْمِنُ يَأْلَفُ وَيُؤْلَفُ وَلَا خَيْرَ فِيْمَنْ لَا يَأْلَفُ وَلَا يُؤْلَفُ وَخَيْرُ النَّاسِ أَنْفَعُهُمْ لِلنَّاسِ۔ (رواہ الطبرانی فی الاوسط)

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مؤمن تو الفت و محبت کا مرکز ہوتا ہے، اور اس آدمی میں کوئی بھلائی نہیں جو دوسروں سے الفت و محبت نہیں کرتا، اور دوسرے اس سے الفت نہیں کرتے، اور لوگوں میں بہترین شخص وہ ہے جو لوگوں کے لیے زیادہ نفع رساں ہو۔

تشریح: دنیا میں جینے والے انسانوں کے درمیان رنگ ونسل، دین ومذہب اور تہذیب وزبان کے حوالے سے جس طرح فرق وامتیاز اور اختلاف وافتراق پایا جاتا ہے اسی طرح طبیعتوں اور مزاجوں میں تلوّن وتعدّد ایک امر مشاہد ہے، کسی کی طبیعت ومزاج میں خلوت نشینی اور فکر خود بینی ہوتی ہے تو ایسا شخص معاشرہ اور سوسائٹی سے متنفر ومتوحش رہتا ہے، لازماً لوگ بھی اس سے بعد ودوری اختیار کرنے کو عافیت سمجھتے ہیں، اور کسی کی طبیعت و مزاج اس کے برعکس ہوتا ہے، وہ لوگوں کے ساتھ رہ کر آپسی تکلیفوں اور رنجشوں کے کانٹے سہنے برداشت کرنے اور ہمہ وقت فرحت ومسرت کے پھول برسانے کا ہنر جانتا ہے، نتیجتاً لوگ بھی اس سے مانوس اور محب بن جاتے ہیں، لوگوں کے ساتھ اُس کے اِس حسن معاشرت، خدمت خلق اور نفع رسانی کے جذبے کی وجہ سے وہ عنداللہ محبوبیت وخیریت کے مقام بلند کو پالیتا ہے، مذکورہ دونوں اشخاص کے تلوّن مزاجی کے پیش نظر ایک ایسے شخص کے لیے (جس کا اپنے اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان ہے، اور جس کے سامنے اللہ تعالیٰ کے خُلُق عالیہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت مبارکہ ایک کھلی اور روشن کتاب کی طرح ہے) اپنے مزاج اور طبیعت کو جس صورت و ہیئت میں ڈھالنا ضروری ہے اور تقاضۂ ایمان کے عین مطابق وہ یہی ہے کہ مومن صادق کو محبت و الفت خوش

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

مزاجی وملنساری کا پیکر اور عفوو درگزر، اور تحمل و برداشت کا مرکز ہونا چاہیے، اِس طرح کہ وہ خود بھی لوگوں سے مانوس ہو، اور لوگ بھی اس سے مانوس ہوں، اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اگر مزاج وطبیعت میں ایسی خوشگوار کیفیت پیدا نہیں ہوتی ہے تو بہ زبان صادق ومصدوق ﷺ اس کے اندر کوئی خیر وبھلائی نہیں ہے، اس قسم کے لوگ کسی بھی مرحلۂ حیات میں خلق خدا کے لیے سود مند اور مفید بھی ثابت نہیں ہوتے ہیں۔

حدیث مذکور میں رسول اللہ ﷺ نے اسی اہم بات کی نصیحت فرمائی ہے کہ مومن تو الفت ومحبت کا مرکز ہوتا ہے، سب لوگوں سے محبت وخیر خواہی اور نفع رسانی کا رشتہ رکھتا ہے، اور ایسا آدمی کوئی بھلائی اور خیر کا مستحق نہیں ہے جو نہ خود دوسروں سے الفت محبت کا ربط قائم رکھتا ہے نہ دوسرے اس سے ایسا تعلق رکھنا چاہتے ہیں، اور سارے لوگوں میں سب سے بہترین پسندیدہ شخص وہ ہے جو لوگوں کو نفع پہنچانے کے لیے ہمیشہ فکر مند اور سرگرم عمل رہتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ سے بھی ہمیں یہی سبق ملتا ہے، پہلی وحی کے نزول کے بعد جب آپ ﷺ پر حزن وغم کی ایک مخصوص کیفیت طاری ہوئی، اور بڑی گھبراہٹ اور بے چینی کے عالم میں گھر تشریف لاکر زوجہ مطہرہ حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اپنی مخصوص کیفیت کو بیان کر کے یہ فرمایا تھا کہ مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے تو اس وقت حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ ﷺ کے جن محاسن ومحامد کا ذکر فرمایا وہ آبِ زر سے لکھنے اور ہم سب کے لیے تعمیل واتباع کے لائق ہے ''حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: آپ کو بشارت ہو، آپ ہرگز نہ ڈریے، خدا کی قسم! اللہ آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا، آپ تو صلۂ رحمی کرتے ہیں، آپ کی صلۂ رحمی بالکل محقق ہے، ہمیشہ سچ بولتے ہیں، لوگوں کے بوجھ کو اٹھاتے ہیں، یعنی دوسروں کے قرضے اپنے سر رکھتے ہیں، اور ناداروں کی خبر گیری فرماتے ہیں، امین ہیں لوگوں کی امانتیں ادا کرتے ہیں، مہمانوں کی ضیافت کا حق ادا کرتے ہیں۔'' (بخاری ۱/ ۴ بحوالہ سیرت المصطفی ۱/ ۱۴۵)

خلاصہ یہ کہ ہمیں بھی تمام لوگوں کے ساتھ انسیت ومحبت کا معاملہ رکھ کے ہمیشہ نفع رسانی کے لئے فکر مند رہنا چاہیے، یہی سنت نبوی ہے، اور یہی انسانیت وآدمیت کے زیادہ لائق بات ہے۔

اللہ پاک ہم سب کو نبی پاک ﷺ کی سیرت طیبہ کے اس اہم پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے حدیثِ مذکور کے اہم ترین پیغام پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

پیش گفتار

مدارسِ دینیہ اسلامیہ سے

مقاصد و مطالبات کی روشنی میں چند گذارشیں[1]

از: مدیر

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ وبہٖ نستعین

مدارسِ دینیہ اسلامیہ ہر زمانے کی اہم ترین ضرورت اور مسلمانانِ ہند کے لئے اپنے دین؛ عقیدہ؛ اور تہذیب وثقافت کے تحفظ واشاعت کا اہم ترین وسیلہ ہیں، سب جانتے ہیں کہ دینِ اسلام کتابُ اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بنیادوں پر قائم ہے، ان دونوں کی اپنی تمام تر تفصیلات کے ساتھ حفاظت اور نسلِ نو میں منتقلی کا کام پوری ذمہ داری اور کامل مہارت کے ساتھ ان مدارس ہی میں سرانجام پارہا ہے، انہی دو چیزوں کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے خوش خبری سُنائی تھی کہ جب تک ان ــــ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ــــ کو مسلمان مضبوطی سے تھامے رہیں گے اور سینے سے لگائے رکھیں گے ہرگز گمراہ نہیں ہوں گے اور ان دو چیزوں کے جیتے جاگتے دنیا کی کوئی طاقت دینِ اسلام کو بُری نظروں سے دیکھنے کی جرأت نہیں کرسکتی۔

انہی مدارس دینیہ کی برکت سے اور اسی تعلیم و تعلُّم کے صدقے میں اسلام اپنے آغاز سے لے کر آج تک تروتازہ؛ سدا بہار؛ و پُرانوار ہے، عالم کے چپّے چپّے پر چمک دمک رہا ہے، الحاد وارتداد کے تمام حربے؛ تحریف وتبدیل کی تمام کوششیں؛ اور بے آبروئی ورسوائی کی انفرادی واجتماعی؛ خانگی وسرکاری مساعی اپنی تمام تر توانائی وزور آزمائی کے باوجود ناکام وبے نتیجہ ہیں، دنیا کی کوئی طاقت قرآن کریم کے ایک نقطے کو بدل سکی نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی کسی معمولی سنت کو مٹانے میں کامیاب ہوسکی، یقیناً یہ کام محض انسانوں کی فکر وسعی کا نتیجہ نہیں ہوسکتا، حق تعالیٰ شانہٗ کی قدرت اور وفائے وعدہ ودعویٰ کا کرشمہ ہے لیکن اس کے لئے اسباب کی اس دنیا میں اس نے جو نظام اپنی قدرت سے چلایا وہ تعلیم وتعلُّم کا کامیاب نظام ہے، جو عہدِ نبوی سے لے کر تا ہنوز بلا انقطاع جاری وساری ہے۔

---

[1] جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس منعقدہ ۴/۵/ جولائی ۲۰۲۴ میں جاریہ کردہ تجویز نمبر ۲ اور دینی تعلیمی بورڈ مہاراشٹر کے تحت جالنا اور لاتور میں بلائے گئے معلمین مکتب وذمہ دارانِ مدارس کے سامنے عرض کی گئیں احقر کی معروضات کو مدنظر رکھ کر اس ماہ کا پیش گفتار اس عاجز نے خود مرتب کی ہے۔ محمد عبدالقوی

اس آخری دور میں اور بالخصوص برصغیر میں یہی تعلیم و تعلّم کا مبارک سلسلہ مسلم اقتدار کے خاتمے اور فرنگی جبر واستبداد کے غلبے کے بعد ایک خاص شان اور بافیض و بابرکت صورت میں مدارسِ دینیہ اسلامیہ کی شکل اختیار کر گیا جس کی ابتداء ام المدارس دارالعلوم دیوبند سے ہوئی اور پھر دیکھتے دیکھتے امانتِ نبوی ___ کتابُ اللہ اور سنتِ رسول اللہ ___ کی حفاظت کے یہ دارالعلوم پورے برصغیر کے طول وعرض میں پھیلتے چلے گئے، شہروں سے لے کر قصبوں وقریوں تک ہر طرف قال اللہ وقال الرسول کے نغمے گونجنے لگے، الحمدللہ یہ سلسلہ قائم ہے بل کہ روز بہ روز رو بہ ترقی ہے۔

پھر ان مدرسوں کی چہار دیواری میں ایثار وقربانی اور سادگی و یکسوئی کے ساتھ سارے عالم کے بکھیڑوں سے بے نیاز ہو کر دن بھر اور رات کے بڑے حصے میں کتاب اللہ کو سیکھنے؛ رٹنے رٹانے؛ اپنے سینوں میں حرف حرف محفوظ کرنے؛ ایک ایک لغت وقرأت کو جاننے؛ اس کی زبان پر عبور حاصل کرنے؛ اس کے بیان یعنی احادیث کو جاننے سمجھنے؛ اس کے احکام یعنی فقہ اسلامی سے واقفیت حاصل کرنے؛ اس کی روح وحقیقت یعنی تعلق مع اللہ کو جذب کرنے میں لگے ہوئے ہزار ہا بچے اپنی عمر کے چودہ پندرہ برس کھپا دینے کے بعد اپنے اپنے علاقوں میں جا کر جہل کے اندھیروں کو علم کے نور سے منور کرنے میں مشغول ہو جاتے ہیں، اور یہی لوگ علماء کہلاتے ہیں۔

غور کیا جاسکتا ہے کہ ڈیڑھ سو سال قبل کے ہندوستان میں مسلمانوں کا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے بارے میں شعور کیا تھا؟ اور اب کیا ہے؟ مسلم ہندوستان جس پر مغل شہنشاہوں کا شان دار اقتدار سایہ فگن تھا اس میں بھی علوم دینیہ اسلامیہ کی وہ عمومی باغ و بہار جو بستی بستی کو اپنی جاں فضا جھونکوں سے مخمور اور ایمان افزا خوشبو سے معطر کر دے اس طرح موجود نظر نہیں آتی جو تحریک مدارس کے بعد غیر مسلم ہندوستان میں آج نظر آرہی ہے، یہ سب انہی مدارس دینیہ اسلامیہ کے فضلاء کی انتھک بے غرض اور مخلصانہ کوششوں اور قربانیوں ہی کا ثمرہ ہے۔

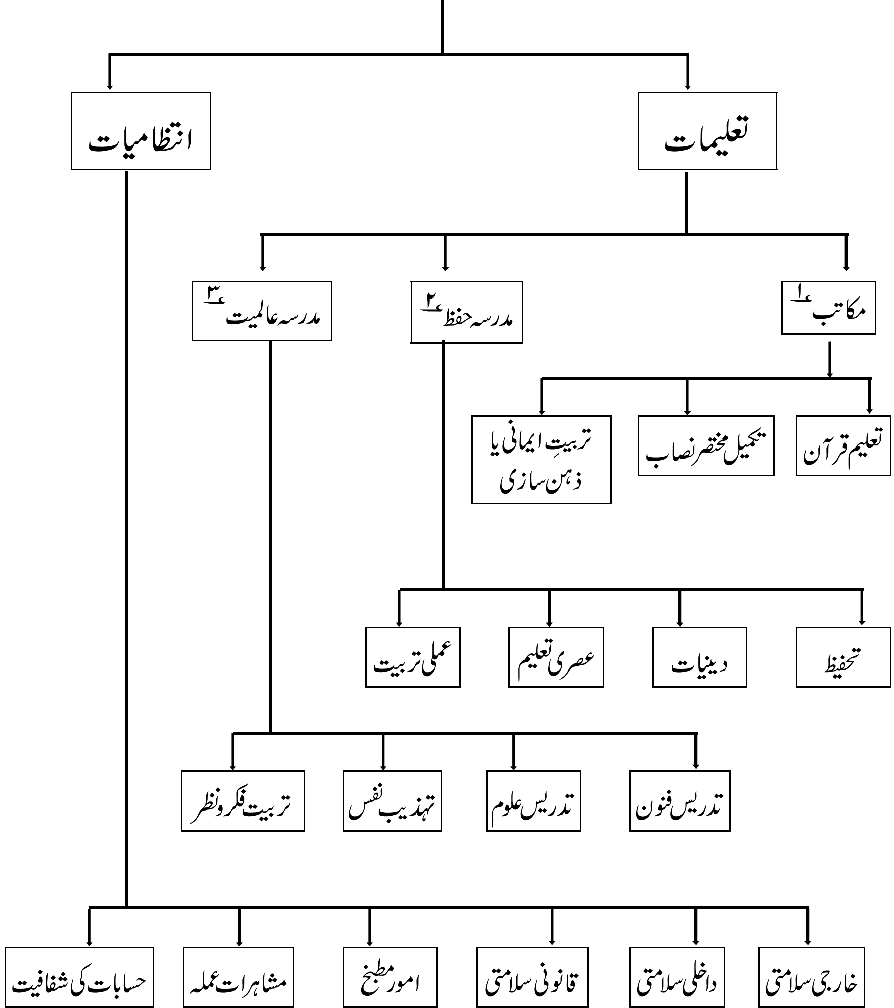
یہ بندے اندرون مدرسہ پیش آمدہ مشکلوں ___ غریب الوطنی؛ اہل قرابت سے دوری؛ ماں باپ کی شفقتوں سے محرومی؛ دُکھ درد میں تنہائی؛ اجنبی ساتھی؛ اجنبی اساتذہ؛ اجنبی غذائیں؛ اپنوں کی اور اپنے دیار کی یادیں وغیرہ___ کیا کیا سہتے ہوئے زندگی کے چودہ پندرہ برس گزار کر جب میدانِ عمل میں جاتے ہیں تو انہیں ذمہ دارانِ مدارس ومساجد کی تنگ نظری قوم کی بے حسی؛ جز معاشی و پریشان حالی کی سوغات ہاتھ آتی ہے، لیکن سلام ہو ان فضلائے مدارس کی جرأت وغیرت کو کہ انہی کے دم خم سے بستی بستی بہار اسلام قائم ہے، ہر عیش و

عشرت ؛فراخی وخوشحالی ہم وطنوں کے لیے چھوڑ کر اپنے لیے ملت کی تعلیمی وتبلیغی اور اصلاحی خدمت اور معمولی نذرانوں پر قناعت کو پسند کر لیتے ہیں اور ہنسی خوشی جیتے ہوئے بارگاہِ نبوت سے ملی اپنی وراثت علم امت مسلمہ میں بانٹنے میں لگ جاتے ہیں نہ کسی کا گلہ ہے نہ کسی سے حسد!

واقعہ یہ ہے کہ برصغیر میں مدارس دینیہ کی یہ تحریک قائم ہی اس کے لیے ہوئی تھی کہ اسلام اور مسلمان دونوں کی حفاظت ___ جو مسلم حکومت کے ختم ہوجانے اور اس کی واپسی یا خلافت عثمانیہ کی سر پرستی کے امکانات موہوم ہوجانے کی وجہ سے خطرے میں پڑ گئی تھی ___ کے لیے مخلص وجاں نثار رجالِ کار تیار کیے جائیں جن کے پاس کتاب وسنت کا وافر علم ہو؛ اس کے مطابق عمل ہو؛ اور وہ ملت اسلامیہ کی صلاح وفلاح کے جذبے سے معمور ہوں، ان کی نگاہیں آخرت کے اجروثواب پر مرکوز ہوں، اور قلوب یادِ الٰہی سے بھر پور مخمور ہوں یہی سیدُ الطائفہ کی آرزو حجت الاسلام کی جستجو ،امام ربانی کی تڑپ اور شیخ الہند کی فکر تھی ،اسی مقصد کا مظہر تھانہ بھون کے حکیم الامت ؛ دیوبند کے شیخ الاسلام ؛ کشمیر کے محدث العصر ؛ انبہیٹہ کے محدث جلیل ؛ اور کاندھلہ کے داعئِ کبیر وغیرہ اور ان کے عبقری اور انقلابی تلامذہ جیسی بے شمار شخصیات تھیں جو تحریک مدرسہ کے چشمۂ صافی سے علوم نبویہ کی بے پناہ صلاحیتوں کو دامن دل میں بھر کر اور آفتاب ومہتاب بن کر چمکے اور اسلام ومسلمانوں کو درپیش خطرات الحاد وارتداد کے لیے سدِّ سکندری ثابت ہوئے، پھر ان کے بعد یہ سلسلہ مسلسل پھلتا پھولتا رہا اور اب بھی پھل پھول رہا ہے، خدائے پاک اس سلسلے کو تا قیام قیامت یوں ہی پھلتا پھولتا رکھے۔آمین۔

آج کی صحبت میں انہی مدارس کی فعالیت کو قائم رکھنے اور ان کے وسائل وذرائع کو زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے اور زیادہ مؤثر بنانے کے سلسلے میں ذمہ دارانِ مدارس کو متوجہ کرنے اور اپنے افکار ذہنی و جذباتِ قلبی کو ان کے درمیان تقسیم کرنے کے لیے قلم اٹھایا ہوں اور بہت سوچ سمجھ کر اٹھایا ہوں، اور اس یقین کے ساتھ اٹھایا ہوں کہ اگر مدارسِ دینیہ کے ارباب حل وعقد اب بھی نہ جاگے تو جاگنے کا وقت ختم ہوجائے گا اور تحریک مدارس کے مقاصد ومنافع کا ناقابل تلافی نقصان ہو چکا ہوگا۔

اب سب سے پہلے ذمہ داران مدارس کے سامنے مدارس اور ان سے متعلق سرگرمیوں کا ایک خاکہ پیش کرتا ہوں پھر اس کی کچھ تفصیل پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔



نوٹ: اسی جدول کے مطابق اگلے صفحات میں تفصیل سے گفتگو کی جا رہی ہے۔

دینی مدارس کا مقصد:

ایسے روشن ضمیر اور بیدار مغز افراد کو تیار کرنا جو اپنی شاندار صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ملک وملت کی خدمت اور تحفظ اسلام کا فریضہ انجام دے سکیں۔

وسائل وذرائع:

بیدار مغزی کے لیے علوم شرعیہ وعقلیہ اور روشن ضمیری کے لیے تعلق مع اللہ اور تقوی اللہ کا اہتمام، ان دونوں کے حصول کے لیے فنون کے ماہرین؛ علمائے ربانین؛ اور مشائخ کاملین کی فراہمی، اس سیکھنے سکھانے کے لیے متعلقہ سہولتوں کی موجودگی پھر ان سب کی تکمیل کے لیے مالیے کی فراہمی۔

ان کاموں کو ہم دو عنوانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ۱ء تعلیمات ۲ء انتظامیات۔

تعلیمات:

اس شعبے کے تحت ۱ء بنیادی مکاتب ۲ء مدارسِ حفظ و دینیات ۳ء مدارس علوم عالیہ (عالمیت ومزید) آتے ہیں، اور تینوں کے فرائض ووظائف مختلف ہیں جو ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں، یہ ذہن میں رہے کہ ہمارے اکابر کے ہاں نری تعلیم کا کوئی تصور نہیں تھا، ہمیشہ تعلیم مع تربیت ان کا طرزِ عمل رہا، اس لیے کہ وہ علم ہی کیا جو عالم کو عمل پر نہ ڈالے؟ سب سے پہلے اور سب سے بڑے معلم نے ہی تو فرمایا تھا وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ۔ مدارس کی تعلیمی سرگرمیوں کو درجِ ذیل عنوانات کے تحت لایا جا سکتا ہے۔

۱ء مکتب:

پہلے زمانے میں ابتدائی فکری تربیت اور تحفیظ القرآن کی جگہ کو مکتب کہا جاتا تھا لیکن ہمارے ان دیار کے عرف میں اسکولی بچوں اور مدارس میں نہ آنے والوں کو قرآن مجید با تجوید کی تعلیم دینے اور ضروریاتِ دین سے آگاہ کیے جانے کی جگہ کو مکتب کہا جاتا ہے، اب مکتب اور مکاتب کے الفاظ سے فوری طور پر ذہن یہی مطلب لیتا ہے، اس لیے ہماری بھی مکتب سے یہاں یہی مراد ہے۔ مکاتب بایں معنیٰ کی آج بہت سخت ضرورت ہے، جمیعۃ علماء ہند کے تحت دینی تعلیمی بورڈ کے قیام کا ایک اہم عُنصر یہی ہے کہ عامۂ مسلمین ـــ اطفال و بالغین مرد و خواتین ـــ سبھی کے لیے بہ قدرِ ضرورت علم دین کا جز وقتی اور آسان نظام قائم کیا جائے، کیوں کہ اس قدر علمِ دین کا حاصل کرنا، مسلم مرد وخواتین کا بنیادی فریضہ ہے، جو فرضِ عین کہلاتا ہے اور اس سے مفر کی کوئی شکل نہیں ہے، مدارسِ دینیہ کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ اپنے اطراف واکناف میں مسلمانوں کے لئے اس

فریضۂ عینیہ کے حصول کا معقول بندوبست کریں۔اس وقت الحمدللہ مکاتب کی مہم ملک میں زوروشور سے جاری ہےاورنو فارغ علماء بہ طور خاص اس کام میں زیادہ حصہ لے رہے ہیں، بڑی تعداد میں مسلم بچے ان مکاتب سے استفادہ بھی کررہے ہیں، بعض جگہ کا کام بعض دیگر جگہوں سے نمایاں ہے، اگرچہ ان مکاتب چلانے والوں کی عام شکایت یہ ہے کہ بچوں کے سرپرستوں کا تعاون انہیں حاصل نہیں ہوتا، کہیں بالکل نہیں کہیں جیسا ہونا چاہیے ویسانہیں، پھر یہ مکاتب بعض جگہ مسجد کمیٹیوں کے تحت، بعض جگہ دینی تعلیمی بورڈ کے تحت، بعض جگہ دینیات بورڈ کے تحت، بعض جگہ علاقائی تنظیموں کے تحت، بعض جگہ مدرسوں کے زیرانتظام، بعض جگہ معلم کی انفرادی شخصی مساعی کے تحت چل رہے ہیں، پھران میں بعض منظم ہیں بعض بہتر اور بعض برائے نام تکمیل رسم کے طور پر ہیں۔

''منظم مکاتب'' ایک مخصوص اصطلاح ہے،اوراس کا مطلب یہ ہے کہ کسی خاص نصاب، خاص وردی؛ خاص ترتیب کے ساتھ چلایا جائے، بچوں سے معقول فیس لی جائے، اساتذہ کو معقول نذرانہ دیا جائے، اور بچوں کی تحریض وترغیب کے لیے مختلف اقدامات کیے جائیں، ان منظم مکاتب کی بھی اچھی خاصی تعداد اور نمایاں کارگزاریاں ہیں۔ بہت سے مکاتب جو ایسے نہیں ہیں مگر معلم منتظم مزاج ومتفکر قسم کا ہے تو ان کی کارکردگی بھی لائق ستائش وقابل تعریف ہے، ان کے برخلاف بہت سے مکاتب خانہ پوری کے لیے چل رہے ہیں جس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ یا تو معلم کے سامنے کوئی مقصد نہیں ہے یا پھر وہ اسے صرف ذریعۂ معاش کی نظر سے دیکھتا ہے، ظاہر ہے کہ دونوں صورتوں میں مکتب کا چلنا نہ چلنا دونوں برابر ہے۔

منظم مکاتب بمعنی المذکور کے بارے میں میرا خیال وتجربہ یہ ہے کہ وہ معاشی طور پر متمول ومتوسط طبقۂ مسلمین میں تو کامیاب ہو سکتے ہیں مگر غریب وجہیل طبقے میں زیادہ کامیاب نہیں ہیں، کیوں کہ نہ اُن کو اس ضرورت کا احساس ہےاور نہ ہی وہ معتد بہ صرفہ کرکے اپنے بچوں کو یہ علم دلانا چاہتے ہیں، باقی دیگر مکاتب میں بعض تو بالکل ہی ناقص ہیں اور بعض باقاعدہ ہیں مگر معلمین کی زیادہ تر توجہ معیار تجوید پر مرکوز رہتی ہے یا پھر تکمیل نصاب پر! اس لیے میں بامقصد مکاتب کے لیے ایک درمیانی اصطلاح ''مؤثر مکتب'' استعمال کرنا چاہتا ہوں یعنی مکاتب چاہیں منظم بمعنی المذکور ہوں یا نہ ہوں مکتب کے حقیقی مقصد کو پورا کرنے میں کامیاب ضرور ہوں۔

مکتب کا حقیقی مقصد:

ان دینی مکاتب کا حقیقی مقصد ایک حدیث کی روشنی میں

(الف) قرآن مجید کو صحیح سے پڑھنا آجانا (ب) عقیدہ وعمل سے متعلق ضروری علم کا حاصل ہوجانا ہے۔

(ج) مسلمانوں کے گھروں کے موجودہ ماحول کی روشنی میں ضروری ہے کہ بچوں کو دینی فکر اور اللہ ورسول سے محبت بھی مکتب ہی میں سکھانی پڑے گی۔ جس مکتب میں یہ تینوں کام ہو رہے ہوں اسی کو ''مؤثر مکتب'' سے تعبیر کر رہا ہوں۔

موثر مکتب کا کام یہی ہے کہ ضروری مقدار تجوید کے ساتھ طلبہ وطالبات کو قرآن مجید پڑھنا آجائے، صلوٰۃ وصیام کے ضروری احکام سے واقفیت ہو جائے کہ یہی دو فریضے سب کے لیے عام ہیں، (بقیہ کے علم کی ضرورت بہ وقتِ ضرورت ہی ہے) نیز عقیدۂ توحید ورسالت وآخرت راسخ کرنے، معرفت رب؛ حبِ رسول؛ عظمتِ قرآن پیدا کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً یا ہفتے میں ایک روز متعین کر کے عام فہم اور بہت ہی سادے انداز میں بچوں کی ذہن سازی بھی کی جانی چاہیے۔ میرے نزدیک اس درجے فرض علم دینے کے لیے ایک حدیث کی روشنی میں ایک سال کافی ہے پھر اس کے اگلے سالوں میں تجوید دینیات اور اسلامی معلومات درجہ بدرجہ پڑھائی جاتی رہیں تو یہ نیک کام جس قدر ہو کم ہی ہے، لیکن پہلے سال میں اعتدال وسہولت کے ساتھ مذکورہ بالا ترجیحی کام ہو جانا بہت ضروری ہے۔

دیکھا یہ جا رہا ہے کہ قرأت کے شعبوں اور ہمہ وقتی مدرسوں کی طرح مکتب میں نورانی قاعدہ ہی پر اتنی محنت ہو رہی ہے کہ برسوں نکل جا رہے ہیں بچوں کا ناظرہ ہی درست نہیں ہو پا رہا ہے، تجوید کے بھی سب درجات فرضِ عین نہیں ہیں، حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے جمال القران میں فرمایا کہ تجوید کا اس قدر درست ہونا کہ نماز درست ہو جائے فرض عین ہے، اور ظاہر ہے کہ وہ صفات مخارج اور صحت ادا سے زیادہ نہیں، اور یہ میں صرف مکتب کی حد تک کہہ رہا ہوں، ورنہ قران مجید کو جس قدر سنوار کر اور جتنا زیادہ رعایت قواعد کے ساتھ پڑھنا سیکھا جائے نورٌ علی نور اور سرورٌ علی سرور ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مدارس دینیہ کے فرائض میں ایک فریضہ قرب وجوار کی بستیوں کے اندر اپنی نگرانی میں مؤثر مکاتب کا قیام بھی ہے تاکہ بستی کے ماحول میں ایمان وتوحید کی بہاریں مہکتی رہیں، کفر والحاد کو گھسنے کا موقع نہ ملے۔

۲۔ مدرسہ حفظ قرآن:

چند بڑے مدارس کو چھوڑ کر اکثر مدرسے صرف قرآن کریم کے حفظ کے لیے قائم کیے جاتے ہیں اور یقیناً یہ بھی ایک مستقل کام اور اہم فریضۂ اسلام ہے، ان مدرسوں کی ہر جگہ ضرورت بھی ہے اور ان کا وجود خیر وبرکت

بھی ہے۔ لیکن یہ مدرسے عام طور پر حقوق وفرائض کے حوالے سے بہت لاپرواہی کا شکار ہیں اور یہاں پڑھنے والے بچے ذمہ داروں کی لاپروائی کی وجہ سے ایک گونا مظلوم ہیں، کیوں کہ حفظ کے مدارس میں زیرِ تعلیم طلباء کا وقت بہت ضائع ہوتا رہتا ہے، ان کے اوقات کا صحیح استعمال ان کے مستقبل کے تقاضوں کے اعتبار سے نہایت کارگر ثابت ہوسکتا ہے، اور اگر ذمہ داروں کی بے فکری و بے حسی ان کے اوقات کو ضائع کرتی رہے تو ذمہ داران مدارس آگے چل کر ان طلبہ کے معتوب اور آخرت میں مسئول ہوں گے کیوں کہ سب جانتے ہیں کہ آدمی سے قیامت کے دن اس کی نعمتِ عمر کے بارے میں سوال ہوگا؟ اگر اسی وقت میں جس میں کہ وہ قاعدہ ناظرہ اور حفظ کی تکمیل کر رہے ہوں مزید ضروری علم سے آراستہ ہو سکتے ہوں پھر بھی ذمہ دار اس کا نظم نہ کریں تو اگر چہ یہ بچے لاشعوری کی وجہ سے ضیاعِ وقت کے سوال سے سبک دوش ہوجائیں لیکن ان کے ذمہ دار کیسے سبک دوش ہوسکیں گے؟ اس لیے مدارس قرآن درج ذیل امور کو اپنے نظام میں شامل کریں تو قوم کے بچوں کا بھی فائدہ ہوگا اور دیانت کا حق بھی ادا ہوگا۔

(الف) تحفیظ القرآن:

چوں کہ اصل مقصد ہی ان مدرسوں کا حفظ قرآن ہے اس لیے یہ ان کا مرکزی عنوان ہے اور اس کے تحت چار باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے ۱ء بچوں کا آموختہ ہمیشہ پختہ رہے بھولنے نہ پائیں، اس کے لیے پڑھے ہوئے کو سننے کی یومیہ مقدار اتنی متناسب ہونی چاہیے کہ کم پارے والوں کا ہر ہفتے ایک دور مکمل ہوتا رہے اور زیادہ پارے والوں کا دس روز میں ایک دور مکمل ہوجائے۔ اگر آموختہ سننے میں اتنی مقدار ملحوظ نہ ہوگی تو بچہ آگے بڑھتا رہے گا پیچھے بھولتا رہے گا۔ حدیث پاک میں ہے کہ قرآن کی نگرانی کرتے رہو کیوں کہ وہ رسی کھولے ہوئے اونٹ سے بھی زیادہ تیزی سے سینوں میں سے نکل جاتا ہے۔ بہت سے مدارس میں اس کا خیال نہیں ہوتا جس کے نتیجے میں ایک تو طلبہ تکمیل حفظ ہی میں خاصا وقت لگا دیتے ہیں پھر دور کے لیے مستقل وقت دیتے ہیں، چناں چہ ان کی عمر کا بڑا حصہ اسی میں نکل جاتا ہے پھر بھی جید ومجوِّد شمار نہیں ہوتے، اب وہ اس عمر میں جا کے کیا دنیا پڑھے گا کیا دین کا علم حاصل کرے گا؟ پھر اگر حافظ نہ عالم ہوگا نہ گرائجویٹ تو سماج میں اس کا مقام ہی کیا رہ جائے گا، حافظِ قرآن ہونا بھی تب ہی سعادت ہے جب کہ یاد بھی ہو اور وہ اس کا حق احترام ادا بھی کرتا ہو۔

۲ء دوسری چیز مدارس حفظ کی ذمہ داروں کو یہ ملحوظ رکھنے کی ہے کہ طالب علم کی شروع ہی سے تعلیم تجوید کے مطابق ہو، صفاتِ مخارج یعنی صحیح طور پر تلفظ حروف اور صحتِ ادا یعنی اجراء قواعد کی مشق کرائی جاتی رہے، چوں کہ

قرآن کریم عربی زبان میں ہے اور ہماری زبانیں عجم ہیں، اس لئے مخارج حروف کا صحیح کرنا تلفظِ حروفِ عربیہ کے صحیح ہونے کے لئے اور قواعد التجوید کا پابند تلاوتِ قرآن کا حق ادا کرنے کے لئے بہت ضروری ہے۔

۳۔ تیسری ضروری بات تلاوت قرآن میں عربی لہجے کی رعایت ہے، عربی لحن مطلوب شرعی بھی ہے اور قلب پر زیادہ اثر انداز بھی ہوتا ہے، عام طور سے مخارج حروف کو صحیح کرانے پر اتنی توجہ دی جاتی ہے کہ قرآن کریم برائے فطری عربی لہجے کے عجمی انداز میں پڑھا جانے لگتا ہے، جو مخارج میں غلو اور بلا ضرورت جھٹکوں کی شکل اختیار کر کے لحن کی تاثیر کھو دیتا ہے، قرآن مجید بلسان عربی مبین اُترا ہے اور اپنے اصل لب و لہجے ہی میں حسین اور مؤثر ہوتا ہے اس لیے اس کا بہت خیال معلمینِ حفظ اور ذمہ دارانِ مدارس کو رکھنا چاہیے۔

۴۔ اس بات کا بھی بہت خیال رکھنا چاہیے کہ سبق میں کہیں لحنِ جلی رہ نہ جائے، بھول کی غلطیاں تو پکڑ لی جاتی ہیں لیکن کھڑے پڑے کی غلطی؛ حروف کے ردو بدل کی غلطی؛ تقدیم و تاخیر کی غلطی اکثر پکڑ میں نہیں آتی، بالخصوص وہ اساتذہ جن کا خود قرآن کریم پختہ نہیں ہوتا وہ ایسی غلطیوں پر گرفت نہیں کر پاتے جو طالب علم کی تلاوت میں ہمیشہ باقی رہ جاتی ہیں، حالاں کہ بھول کے مقابلے میں ایسی غلطیاں معانی میں کافی تبدیلی بل کہ بسا اوقات فسادِ صلاۃ کا سبب بن جاتی ہیں، تجربہ یہ ہے کہ بھول کی غلطی کا تو اکثر طالب علم ذمہ دار ہوتا ہے لیکن لحنِ جلی کا سبب اساتذہ کا عدمِ اعتناء ہوتا ہے، وہ اکثر سبق سنانے میں رہ جاتی ہے، اس لیے اساتذۂ حفظ کو خود اپنا قرآن بہت ہی پختہ رکھنا چاہیے اور سبق سننے کے دوران تلفظِ الفاظ پر گہری نظر رکھنا چاہیے تاکہ کوئی غلطی مخفی نہ رہ جائے۔

(ب) دینیات:

مدارس حفظ میں باتجوید تحفیظ کے بنیادی کام کے ساتھ ساتھ جو دوسرا اہم کام ہونا چاہیے وہ ہے بچوں کو بہ قدر ضرورت اور فرض عین درجے کے احکام سے واقف کرایا جائے، ان کو عقیدے یاد کرائے جائیں، کلمات درست کرائے جائیں، چہل حدیث اور مسنون دعاؤں کے علاوہ نماز کا مسنون طریقہ اور پاکی ناپاکی کے ضروری احکام یاد دلائے جائیں، اگر طلبہ بالغ یا مراہق (بلوغ کے قریب) ہوں تو انہیں مزید ضروری احکام سے واقف کرانے کا انتظام کیا جائے، اردو لکھنا پڑھنا سکھایا جائے۔

دیکھئے! حفظ کرنا تو فرض کفایہ ہے لیکن ضروری علم حاصل کرنا فرض عین ہے، اکثر مدارس اس کی جانب مطلق توجہ نہیں کرتے، بہت سے طلبہ مدرسے میں رہتے ہوئے بالغ ہو کر تکلیفات شرعیہ کے مکلف ہو جاتے ہیں

مگر وہ احکام کا علم نہ ہونے کی وجہ سے غسل جنابت کا اہتمام نہیں کرتے، مسجد میں چلے جاتے ہیں نماز بھی پڑھ لیتے ہیں ان گناہوں کی جواب دہی کیا مدرسے والوں کے سر نہیں ہے؟ اسی طرح کئی مدارس میں اردو لکھنا پڑھنا تک نہیں سکھایا جاتا جس کی وجہ سے بچے عالمیت میں داخلہ لے نہیں پاتے یا لے لیتے ہیں تو چل نہیں پاتے، ایسے طلباء کی محرومی علم کے کیا مدرسے والے جواب دہ نہیں ہوں گے؟ میں نے خود کتنے ہی ذہین و ہونہار طلباء کو محض اردو نہ آنے کی وجہ سے ترک تعلیم کرتے دیکھا ہے، آج بھی وہ اہل مدرسہ کو اپنی حق تلفی کے ساتھ یاد کرتے ہیں ہمارے ہاں عالمیت کا ذریعہ تعلیم اردو زبان ہی ہے، اس لئے تکمیل حفظ تک طلبہ کو اردو لکھنا پڑھنا آجانا چاہیئے۔

(ج) عصری علوم:

قاعدے سے لے کر تکمیل حفظ تک بعض بچوں کے کم از کم چار سال تو مدرسے میں گزرتے ہیں اور بعض بعض کے تو آٹھ دس سال بھی اسی میں نکل جاتے ہیں، اتنا عرصہ اگر کسی اسکول میں ہوتے تو چھٹویں ساتویں جماعت تک پہنچ جاتے، چند ایک مدارس کو چھوڑ کر اکثر مدارس حفظ کا حال یہ ہے کہ وہ طلبہ پر کوئی خاص محنت نہیں کرتے اور اختتام حفظ کے لیے کوئی میعاد مدنظر نہیں رکھتے، کسی عمر میں آئیں خواہ کسی عمر تک حفظ کے بہانے مدرسے میں پڑے رہیں ذمہ داروں کو ان کے مستقبل کی طرف سے اور ان کی عمر کے ضیاع کی طرف سے کوئی فکر نہیں رہتی، اس کی وجہ یہ ہے کہ مدارس میں عمر اور تعلیم کا کوئی متناسب پلان نہیں ہوتا، کئی بچے حفظ کے چکر میں اٹھارہ اُنیس سال مدارس میں نکال لیتے ہیں اور سوائے حفظ کے اور کچھ نہیں جانتے، وہ حفظ بھی کچا پکا ہی ہوتا ہے، اب اس عمر میں چوں کہ عالمیت کے لیے آٹھ سال نہیں نکال پاتا تو اس میں نہیں جاتا اور عصری تعلیم بالکل نہیں جانتا اس لیے شرم و عار کی وجہ سے اس میں نہیں جاتا، اس لیے کسی کام دھندے میں لگ کر برباد ہو جاتا ہے یا پھر معمولی نذرانوں پر کسی دین کی خدمت میں لگ جاتا ہے، سماج میں نہ اس کا کوئی مقام ہوتا ہے نہ عزت!

اس لیے ضروری ہے کہ حفظ کے مدارس اپنے ہاں آنے والے طلباء کے لیے اتیج پلان کے ساتھ جامع نصاب بنائیں، مثلاً آٹھ نو برس کی عمر میں داخلہ دیں، تین سال میں قاعدہ؛ مکمل ناظرہ؛ اور ایک یا دو پارے حفظ کراتے ہوئے عصری علوم کا کم از کم پانچ سالہ اختیاری نصاب مکمل کرادیں، اس کے بعد حفظ شروع کرائیں پہلی دو منزلوں کے دوران چھٹویں اور ساتویں جماعت کا مشترک نصاب پڑھا دیں، تیسری منزل سے عصری تعلیم روک کر بچے کی پوری توجہ حفظ قرآن کی طرف لگوادیں، اس طرح وہ اپنی عمر کے تیرھویں، چودھویں یا زیادہ سے

زیادہ پندرھویں سال میں ساتویں جماعت کے ساتھ حفظ قرآن مکمل کرلے گا، اس کے بعد عالمیت کا آغاز نہایت مناسب عمر میں ہوجائے گا، عالمیت کے ابتدائی تین سالوں میں صِرف صرف ونحو اور زبان عرب سیکھنا ہوتا ہے برائے نام دینیات ہوتی ہے جو اردو زبان میں وہ پہلے ہی پڑھا ہوا ہوتا ہے، اس لیے گھنٹیوں کی تعداد آٹھ بنا کر چار گھنٹیاں عربی گرامر اور اس کے ضروری نصاب کے لیے رکھی جائیں اور چار گھنٹیاں عصری تعلیم کے لیے مختص کردی جائیں، دارالاقامہ میں رہ کر اس عمر کے طلباء بہ سہولت دونوں کام اچھی طرح انجام دے سکتے ہیں گزشتہ تین سالوں سے راقم سطور خود اس کا تجربہ کررہا ہے، جماعت چہارم سے پھر پوری یکسوئی کے ساتھ علوم عالیہ کی تحصیل میں لگا دیا جائے، اس طرح ''قانون حق لازمی تعلیم''ـــ اگرچہ کہ فی الحال مسلمان اس سے مستثنیٰ ہیں لیکن یہ استثنیٰ کبھی ختم بھی ہوسکتا ہےـــ کی مخالفت سے بھی بچ جائیں گے ''نیو ایجوکیشن پالیسی'' کے خطرات سے بھی حفاظت ہوجائے گی، اور خود ایک عالم دین کو اپنے مقصدِ حقیقی ''دعوت ودفاعِ اسلام'' میں کامیاب ہونے میں یہ علوم مددگار بھی ثابت ہوں گے۔

اسی لیے میں کہتا ہوں کہ دینی مدارس کے طلباء کو'' قانون حق لازمی تعلیم'' سے مستثنیٰ کیوں رکھا جائے جب وہ ایک کارآمد مفیدِ مقصد چیز ہے تو اُسے اپنے رنگ میں رنگ کر اپنے نظام کا حصہ کیوں نہ بنالیا جائے؟ تجربہ یہی ہے کہ اگر بہ قدرِ ضرورت عصری تعلیم مدرسے کے پاکیزہ اور مبارک ماحول میں دی جائے تو ضمنی مضر اثرات کا خطرہ بھی نہیں رہتا اور طلبہ کو ایک کام کی چیز ہاتھ لگ جاتی ہے جو عمر بھر کام دیتی ہے، آج اکثر فضلائے مدارس باوجود اچھی علمی استعداد کے بھی اپنے ملک اور پورے عالم کی سیاسیات، معاشیات، سماجیات اور ماحولیات سے بالکل بے خبر ہیں یا پھر اس سلسلے میں اپنی بے خبری وبے بسی پر افسوس کرتے رہتے ہیں اس طرح سوشل میڈیا کے فتنوں سے خود متاثر ہوجا رہے ہیں، چہ جائے کہ دوسروں کو محفوظ رکھتے![1]

بہرحال اہل زمانہ کی زبان ومزاج سے واقف ہونا اور حالات زمانہ کے نشیب وفراز پر نظر رکھے ہوئے ہونا اہل علم کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت بقدرِ ضرورت عصری تعلیم کے بغیر پوری نہیں ہوگی، اس لیے حفظ کے

---

[1] ان سطروں کو لکھتے ہوئے میں نے اپنے ایک عقیدت مند دین پسند ڈاکٹر صاحب کو فون کرکے کہا کہ دو چار دن سے کچھ ضعف و نقاہت محسوس کررہا ہوں تو انہوں نے تعجب سے پوچھا: جی! جی! پھر میں نے کہا کہ ویکنس محسوس کررہا ہوں تو خود ملنے کے لیے آئے اور جتنی گفتگو کی اس کو میں تخمینی طور پر سمجھتا رہا۔ میں نے سوچا کہ زمانے کے پڑھے لکھے لوگوں کو روزمرہ کی باتیں ہم کسی واسطے کے بغیر سمجھا نہیں سکتے اور ان کی باتیں صحیح سے سمجھ نہیں سکتے تو ایمان وعقیدے کے حوالے سے ان کے خدشات وخیالات کی اصلاح کیسے کرسکتے ہیں؟

مدارس کے نظام کو ہم آہنگ زمانہ بنانا بہت ضروری ہے تاکہ عصری تعلیم کا وہ حصہ جو بڑی عمر میں مختلف وجوہ سے سیکھا نہیں جا سکتا بچپن ہی میں طلباء کو حاصل ہو جائے، بعد میں وہ اس کی بنیاد پر اپنی داعیانہ ودافعانہ صلاحیتوں میں مزید نکھار پیدا کر لیں گے جو کہ مدارس کے وجود کا حقیقی مقصد ہے، اس مختصر تحریر کے زیادہ طویل ہو جانے کا خطرہ نہ ہوتا تو میں اپنی اس تجویز کو طویل تجربات اور اکابر دیو بند کی تائیدات کے ساتھ مفصل پیش کرتا کہ جس چیز کو طلبہ علم دین کے لیے سمِ قاتل اور شجر ممنوعہ قرار دیا جا رہا ہے اسی کی کمی امت کے ایک بڑے طبقے تک حق کی آواز نہ پہنچ سکنے اور ان کے علماء حق سے دور ہو جانے کا سبب بن رہی ہے، میں نہیں سمجھ پاتا کہ اہل مدارس اس حقیقت کو کیوں نہیں قبول کرتے؟ آخر دین کا علم بدلنے کو تو نہیں کہا جا رہا ہے قرآن، حدیث اور فقہ اسلامی کی کسی نئی تشریح کی دعوت تو نہیں دی جا رہی ہے، میں تو فکرِ سلف کو کہفِ ایمان سمجھتا ہوں، بات صرف ذرائع واسبابِ دعوت کو مؤثر بنانے کے لیے مطلوب ضرورتوں کو پورا کرنے کی ہے۔

ہاں! یہ کام اسی خیال سے اور اسی ضرورت کو مدنظر رکھ کر ہونا چاہیے، کسی مرعوبیت اور طمع دنیا کی غرض سے نہیں کیا جانا چاہیے، بعض لوگوں کو عصری تعلیم کا خیال علم دین کے ــــ نعوذ باللہ ــــ ناکافی ہونے یا اس کی وجہ سے حطامِ دنیا سے محروم رہ جانے کے احساس کے تحت ہوتا ہے، ایسے لوگ طلباء کے متاعِ علم وفکر کی لٹیا ہی ڈبو کے رکھ دیں گے، جیسے کہیں کہیں دیکھنے کو ملتا ہے کہ مدرسے کے ذمہ داروں نے حفظ کی درسگاہوں سے کہیں عمدہ کمپیوٹر لیاب تیار کر رکھا ہے اور مہمانوں کو بڑے اہتمام اور فخریہ انداز میں وہی لے جا کے دکھاتے رہتے ہیں کہ یہ بھی ہمارے ہاں سکھایا جاتا ہے۔ اور یہ بے بصیرت اور کم فہم لوگ کیا سمجھیں کہ مقاصد وذرائع میں زمین آسمان کا فرق ہے، موتی اس لیے قیمتی نہیں ہے کہ وہ خوبصورت ڈبے میں رکھی ہوئی ہے، اس ڈبے کی قسمت ہے کہ اس میں موتی رکھی گئی ہے، علم دین کو عصری تعلیم پر ترجیح تو کیا ہو سکتی ہے برابری بھی حاصل نہیں ہے، وہ ایک ضرورت ہے **والضرورة تتقدر بقدر الضرورة**۔ کاش! میں طلبۂ علوم دینیہ کے لیے مدرسے ہی کے ماحول میں بہ قدر ضرورت عصری تعلیم کی اہمیت ــــ اہل مدارس کو گم راہ کئے بغیر ــــ سمجھا سکنے کی کوئی مؤثر اور محتاط ومحفوظ تعبیر اختیار کر سکتا لیکن اپنی کوتاہئ علم اور تہی دامنئ ادب سے بے بس ہو جاتا ہوں، ادھر اکثر اربابِ مدارس کا حال یہ ہے کہ ان كنت لا تدري فتلك مصيبة وان كنت تدري فالمصيبه اعظم۔

(د) عملی تربیت

مدارس حفظ میں اکثر کمسن طلبہ ہی ہوتے ہیں، انہیں محض قرآن پڑھا دینا اور دینیات رٹا دینا کافی نہیں ہے

اہلِ مدارس کی ذمہ داری ہے کہ ان کی عملی واخلاقی تہذیب وتادیب کا بھی مؤثر انتظام کریں، ان کے رہن سہن، بود وباش، رفتار وگفتار میں سلیقہ وشرافت پیدا کرنے کی سعی کی جائے، لباس تو ہم اہل اللہ کا پہناتے ہیں مگر ان کی صفات سے متصف کرنے کی کوشش نہیں کرتے، کریں گے بھی کیسے جب کہ ہم خود خلق محمدی سے آراستہ نہیں ہوتے اور اپنی عملی ومعاشرتی زندگی میں بہت سی اخلاقی کوتاہیوں کا شکار رہتے ہیں، اس لئے مدرسے میں اساتذہ کی عملی واخلاقی تربیت کا بھی انتظام ہونا چاہیئے، وقتاً فوقتاً مدرسہ کی جانب سے تہذیب وتربیت کے امور پر روشنی ڈالنے کے لئے کسی اللہ والے کی مجلس منعقد ہونی چاہیئے، ذمہ دار اساتذہ کو متوجہ کرتے رہیں، اساتذہ طلبہ کو روک ٹوک اور وعظ ونصیحت کرتے رہیں، یعنی باتوں باتوں میں ان امور کا بھی ذکر کرلیا کریں، غلطیوں پر خصوصی طور سے تنبیہ ونصیحت شفقت وخیر خواہی کے ساتھ کرتے رہا کریں، اعمالِ صالحہ کی ترغیب، نمازوں کے اہتمام؛ مسجد کے احترام؛ سننِ قبلیہ وبعدیہ کی پابندی؛ تلاوتِ قرآن فی النوافل کی ترغیب گو مختصر ہی سہی؛ احوالِ متواردہ سے متعلق منقول ادعیۂ مسنونہ کی ترغیب؛ خاص طور سے آپس میں مہذّب گفتگو کرنے کی تلقین؛ اس کے خلاف دکھائی سنائی دینے پر ان کا حق سمجھ کر تنبیہ وتلقین وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن کا تعلق تربیت سے ہے، پہلے زمانے میں اور خود عہدِ نبوی میں تعلیم وتربیت کا سلسلہ ساتھ ساتھ ہی چلتا تھا، آج مدارس میں شروع ہی سے تربیت کا خیال نہ رکھنے کا نتیجہ یہ ہے کہ استاذ بننے کے بعد بھی اِن میں ناقابلِ ذکر بے تہذیبی نظر آرہی ہے۔

(جاری۔۔۔۔۔)

گوشہ سیرت

تمہاری اللہ کے ہاں بڑی قیمت ہے

از: مرتب*

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دیہاتی آدمی جن کا نام زاہر تھا، وہ دیہات سے آتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے کچھ نہ کچھ ہدیہ لے کر آتے تھے، اور جب وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس قیام کر کے واپس جانے لگتے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اُن کے لئے کوئی چیز تیار کر کے دیتے۔

ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کے بارے میں فرمایا: ''زاہر ہمارا گاؤں ہے اور ہم زاہر کے شہر ہیں''۔ (یعنی دیہات کی اشیاء ہمیں زاہر سے میسر آجاتی ہیں اور شہر کی اشیاء زاہر کو ہم سے مل جاتی ہیں) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن سے بڑی محبت فرماتے تھے، وہ خوب رُو نہیں تھے۔

ایک دفعہ وہ بازار میں اپنا سامان فروخت کر رہے تھے (اتنے میں) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیچھے سے آئے اور اُن کے دونوں ہاتھوں کے نیچے سے دستہائے مبارک لے جا کر اُن کی آنکھوں پر رکھ دیا، وہ دیکھ نہیں پا رہے تھے۔ کہنے لگے: کون ہے؟ چھوڑ و مجھے۔ پھر کسی طرح سمجھ گئے اور جان گئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، تو بنا کسی تاخیر کے دھیرے دھیرے اپنی پیٹھ آقا کے سینۂ مبارک سے لگانے لگے۔ (تاکہ کچھ شرف و برکت حاصل ہو جائے)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بازار میں یہ ندا لگانے لگے: کون اس غلام کو خریدے گا؟

انہوں نے کہا: اگر کوئی خریدے گا تو بہ خدا آپ مجھ سے نقصان اٹھائیں گے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لیکن اللہ کے ہاں تمہاری بڑی قیمت ہے۔

(شمائل الترمذی: ۲۴۲)

فوائد: سبحان اللہ! حدیث شریف غور سے پڑھیں تو سیرت نبوی کے کیسے کیسے فوائد حاصل ہوتے ہیں:

(۱) سماج کے کمزور لوگوں کا لحاظ اور اُن کے ساتھ ترحم و تلطف کا معاملہ۔ (۲) عام امتیوں سے بھی محبت و شفقت بل کہ مزاح۔ (۳) کم حیثیت لوگوں کا ہدیہ قبول کرنا اور اُنھیں ہدیہ دینا۔ (۴) احساسِ کم تری کو احساسِ برتری میں تبدیل کرنا اور اُنھیں حوصلہ مند بنانا۔ (۵) اللہ کا حوالہ دے کر اللہ کی محبت دلوں میں جاگزیں کرنا۔ (۶) عالی منصب ہو کر بھی عامی سے بے تکلفی۔ اللہ پاک ہمیں بھی ان نبوی صفات سے متصف فرمائے۔

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

گوشۂ خواتین

اسلام کی باکمال خواتین

حضرت ام خلاد انصاریہ رضی اللہ عنہا

(حضرت خلاد رضی اللہ عنہ کی والدہ محترمہ)

از: مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی*

نام ونسب:

انصار کے قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتی ہیں، بڑی عظیم صحابیہ ہیں، اسلام کے لئے بڑی قربانیاں دیں۔ ان کا نام علامہ ابن سعدؒ نے عمرۃ بنت سعدؓ ذکر کیا ہے، ان کا نسب اس طرح مذکور ہے، عمرہ بنت سعد بن قیس بن عمرو بن امرئ القیس، بنوحارث بن خزرج سے تعلق رکھتی ہیں۔

(الطبقات الکبری لابن سعد، خلاد بن سوید: ۳/۴۰۱، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، الطبعۃ الاولی: ۱۴۱۰ھ، م ۱۹۹۰)

نکاح

ان کا نکاح سوید بن ثعلبہ (خزرجی) سے ہوا، ان کے صلب سے ایک بیٹے خلاد پیدا ہوئے، جو بڑے مخلص صحابیؓ تھے، قبیلۂ خزرج سے تعلق رکھتے تھے، ان کا نسب اس طرح ہے، خلاد بن سوید بن ثعلبہ بن عمرو بن حارثہ بن امری القیس بن مالک بن الأغر بن ثعلبہ بن کعب بن الخزرج الأنصاری، انہوں نے بیعت عقبہ، غزوۂ بدر، غزوۂ اُحد اور غزوۂ خندق میں شرکت کی۔ ان کے فرزند سائب بن خلاد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت میں یمن کے والی اور حاکم تھے۔

(أسد الغابۃ، خلاد بن السائب، ۲/۱۸۲، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، الطبعۃ الأولی، سنۃ النشر: ۱۴۱۵ھ - ۱۹۹۴م)

بیٹے کی شہادت، ماں کی استقامت

غزوۂ بنوقریظہ میں حضرت خلادؓ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ تھے، ایک یہودی عورت نے جس کا نام ''بنانہ'' تھا جو حکم قرظی کی بیوی تھی، اپنے مکان کی چھت سے چکی کا بھاری پتھر ان پر گرا دیا، جس کی چوٹ سے

---

* ادارہ علم وعرفان، حیدرآباد، واستاذ حدیث دارالعلوم دیودرگ

حضرت خلادؓ شہید ہوگئے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیگر بنو قریظہ کے مردوں کے ساتھ اس عورت کا قتل کردیا، سوائے اس عورت کے علاوہ کسی عورت کو قتل نہیں کیا گیا۔"إن الحجر ألقتها عليه امرأة اسمها بنانة، امرأة من قريظة، ثم قتلها رسول الله ﷺ مع بني قريظة لما قتل من أنهم منهم، ولم يقتل امرأة غيرها"

(اسد الغابۃ، خلاد بن سواد: ۲/۱۷۱۴، دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

والدہ کو خبر ملی تو اپنے فرزند ارجمند کے حوالے سے معلومات حاصل کرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں، اس عظیم واقعے اور سانحہ کے پیش آنے کے باوجود ام خلادؓ اپنے چہرے پر نقاب ڈال کر آئیں تھیں، وہاں پر موجود لوگوں میں سے کسی نے ان سے کہا: تمہارے بیٹے کا قتل ہوگیا ہے، تعجب ہے کہ ایسی مصیبت کے وقت بھی تم نے چہرے پر نقاب ڈالا ہوا ہے۔

انہوں نے نہایت اطمینان سے جواب دیا:"إن كنت رزئت خلادا فلا أرزأ حيائي"(اگر میں نے اپنا بیٹا کھویا ہے تو کیا اب شرم وحیاء بھی کھودوں۔)

(المنتظم فی تاریخ الملوک والأمم: ۳/۲۴۲، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، الطبعۃ الاولی: ۱۴۱۲ھ۔۱۹۹۲م)

اس موقع پر اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں خوشخبری دی کہ"تمہارے فرزند کو دوہرا ثواب ملے گا؛ کیوں کہ انہیں اہل کتاب نے قتل کیا ہے"۔(أما إن له أجر شهدين، وقيل: ولم ذاك يا رسول الله؟ فقال: لأن أهل الكتاب قتلوه)

(الطبقات الکبری لابن سعد، خلاد بن سوید: ۳/۴۰۱، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، الطبعۃ الاولی: ۱۴۱۰ھ، ۱۹۹۰م)

وفات

یہ عظیم صحابیہؓ جن کا یہ جملہ تاریخ میں سنہری حروف میں درج ہے (اگر میں نے اپنا بیٹا کھویا ہے تو کیا اب شرم وحیاء بھی کھودو)"إن كنت زرئت خلادا فلا أزرأ حيائي"، ان کے انہیں قیمتی الفاظ سے ان کا ذکر خیر کتابوں میں ثبت ہے، ان کے اس سے زیادہ احوال نہیں ملتے، ان کی سن وفات کا بھی پتہ نہیں۔

تذکارِ صحابہؓ

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ

از: مولانا عبدالرشید طلحہ نعمانی قاسمی*

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا شمار اُن اکابر صحابہؓ میں ہوتا ہے، جو پہلے پہل دامنِ اسلام سے وابستہ ہوئے اور کلمۂ حق کی شہادت کے بعد مسلسل اذیت وتکلیف سے گزارے گئے؛ جن کی کتابِ زندگی کا ورق ورق علم وفضل، زہد وتقوی، صبر وقناعت، حمیت وشجاعت اور حق گوئی و بے باکی جیسے عظیم اوصاف سے روشن ومنور ہے۔ جو اسلام کے اولین مبلغ، سرکار دوعالم ﷺ کے عاشق صادق، معاشی مساوات کے علم بردار اور بلاخوف لومۃ لائم جرئت اظہار کا حوصلہ رکھنے والے قلندرانہ مزاج کے حامل صحابیؓ تھے۔

سوانحی نقوش:

آپ کا نام نامی: جندب، کنیت: ابوذر، لقب: مسیح الاسلام، والد کا نام: جنادہ تھا، آپ کا قد دراز، رنگ سیاہی مائل، داڑھی گھنی، آخری عمر میں بال بالکل سفید ہو گئے تھے۔ (ابن سعد 4/169) غزوۂ خندق کے بعد سے سارا وقت آپؐ کی خدمت میں رہے، اس سے پہلے اپنے قبیلۂ غفار میں تھے۔ (مسند احمد 5/174) حضرت ابوذرؓ فطرتاً فقیر، زاہد شب زندہ دار اور تارک الدنیا تھے۔ حضرت عثمانؓ کے کہنے پر یا انہوں نے خود مقام ''ربذہ'' میں قیام کی خواہش کی اور وہیں منتقل ہو گئے اور اسی جگہ وصال ہوا۔ وفات کے بعد ایک یمنی قافلہ جو کوفہ سے آرہا تھا ان میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی تھے اس جگہ پر پہنچے تو ان کو غسل دے کر نماز جنازہ پڑھائی اور اسی جگہ پر دفن کر دیا گیا۔ (مستدرک حاکم 3/346)

ایامِ جاہلیت کے ابتدائی حالات:

رئیس القلم مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''حضرت ابوذر غفاریؓ'' میں لکھتے ہیں: یہ بات تقریباً ناممکن ہے کہ انسان جس قوم میں پیدا ہو، اس کے طور طریقے اس پر اثر انداز نہ ہوں۔ الّا ماشاءاللہ، غِفار ایک غارت پیشہ رہزن قوم تھی، کوئی تعجب نہیں اگر حضرت ابوذرؓ میں بھی ان کے عادات وخصائل

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

پیدا ہوتے ، بالآخر یہی ہوا، جب کچھ جوان ہوئے اور تیر وکمان سنبھالنے کی طاقت پیدا ہوئی، دست و بازو نے تلوار کے قبضہ کے طرف اشارہ کیا، تو اٹھے اور جا کر قافلوں کو لوٹ لیا، ریوڑوں کو بھگا لائے، فطری شجاعت نے ان کو اور بھی زیادہ جری بنا دیا تھا، کبھی کبھی زیادہ ولولہ اٹھتا تو تن تنہا راتوں کو قبیلوں پر جا پڑتے، اور عرب کے بہادر گلہ بانوں کو للکار کر تہہ تیغ کرتے ہوئے اونٹوں کو بھگا کر اکیلے اپنے قبیلے تک لے آتے، کبھی خیال گزرتا تو گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بلا کسی رفیق کے کاروانوں کو جا کر لوٹ کھسوٹ لیتے۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے ان کا حملہ پیادہ پا ہوتا تو عجیب چستی و چالاکی سے قافلوں میں گھستے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک بپھرا ہوا شیر بکریوں پر جا پڑا۔ انہیں اپنی اس قزاقانہ مساعی پر قوم کے بزرگوں سے خوب داد ملتی اور چونکہ جوان طبیعتوں کی اشتعال پذیری کے لیے اس سے زیادہ مؤثر اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی تھی، اسی وجہ سے انہوں نے راہزنی میں نمایاں طور پر حصہ لینا شروع کر دیا۔ (حضرت ابوذر:19) بعد میں چل کر یہی زیادتی آپ کے حق میں مفید ثابت ہوئی، غالباً آپ کی فطرتِ سلیمہ بچوں کے شور و بکا، عورتوں کی گریہ وزاری سے بالآخر متاثر ہوئی، آپ کو اپنی ظالمانہ حرکتوں پر سخت ندامت ہوئی اور آپ نے ڈاکہ زنی سے توبہ کر لی۔

بارگاہِ نبوت میں حاضری:

آپ کو جب بعثت نبوی کی اطلاع ملی تو آپ بعض ساتھیوں کے ہم راہ مکہ مکرمہ تشریف لائے، ان دنوں اسلام اور مسلمانون کے تئیں قریش کا قہر و غضب آسمان پر تھا، آپ حضرت علی کے مہمان رہے اور کئی دن تک صرف زم زم پر گزارا کرتے رہے؛ مگر حضور ﷺ کے سلسلے میں کسی سے پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی، بالآخر دریافتی کے بعد احتیاط سے چلتے ہوئے بارگاہِ نبوت میں پہنچ گئے اور چہرۂ انور دیکھتے ہی فوراً بول اُٹھے: ھذا الوجه لیس بکذاب (یہ مبارک چہرہ کسی جھوٹے آدمی کا نہیں ہو سکتا) پھر گفتگو شروع ہوئی۔ آں حضرت ﷺ نے اِسلام کی دعوت پیش کی جس کا خلاصہ یہ تھا: اللہ تعالیٰ کو وحدہ لاشریک سمجھو، وہ اپنی ذات و صفات میں یکتا ہے اور محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں، اچھے کام کرو، نیکی پھیلاؤ، برائی سے بچو اور برائی سے لوگوں کو روکو۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے ان کو تھوڑا سا قرآن سنایا؛ جس کے بعد انہوں نے کلمہ شہادت پڑھ لیا... اس طرح آپ پانچویں نمبر پر دولت اسلام سے مشرف ہوئے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ابوذر! اس وقت اسلام بڑے سخت دور سے گزر رہا ہے۔ مسلمانوں کو اذیت ناک تکلیفیں دی جا رہی ہیں۔ ہماری تعداد اس وقت بہت تھوڑی ہے۔ ہماری حمایت کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ کفار و مشرکین کے دل میں جو آتا ہے، کر گزرتے ہیں اور جتنا کسی کو چاہتے ہیں، مارتے پیٹتے ہیں؛ لہٰذا تم

اپنے ایمان کو ظاہر نہ کرو۔ اور چپ چاپ اپنے قبیلے میں چلے جاؤ۔ وہاں جا کر اسلام کی تلقین کرو اور جو قرآن تم نے مجھ سے سیکھا ہے، یہ لوگوں کو سکھاؤ۔ جب اسلام کا بول بالا ہو جائے، مسلمانوں کی تعداد بڑھ جائے، اس وقت میرے پاس چلے آنا۔ آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کو سنا اور عرض کیا: حضور! میں یہاں سے چلا جاؤں گا، اپنے قبیلہ میں رہوں گا، اسلام کی تلقین کروں گا اور جب اسلام کا غلبہ ہوگا اس وقت حاضر خدمت ہوں گا؛ لیکن میرا دل چاہتا ہے کہ خانۂ کعبہ میں جا کر ایک دفعہ بلند آواز سے لوگوں کو قرآن سناؤں، اس کی اجازت مرحمت فرمائیں۔ آپ علیہ السلام نے ابتداءً منع فرمایا پھر اصرار پر اجازت دے دی۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کاشانۂ نبوت سے نکل کر سیدھے خانۂ کعبہ پہنچے۔ قریشی سردار اور نوجوان سبھی دارالندوہ میں بیٹھے تھے کہ یک لخت قرآن کی آواز ان کے کانوں میں پڑی۔ دوڑ کر کعبہ کے پاس آئے۔ دیکھا کہ ایک نوجوان قرآن پڑھ رہا ہے، سب مل کر اُس پر ٹوٹ پڑے، مار پیٹ کے نتیجہ میں لباس تار تار ہوا اور چہرہ گلنار۔ جسم کا بند بند درد سے چیخ اٹھا؛ لیکن اس بندۂ مومن کی زبان اور لب قرآن کی تلاوت میں مصروف رہے۔ کہیں سے حضرت عباس بن عبدالمطّلب رضی اللہ عنہ آپہنچے تو ان کو دیکھ کر پہچان لیا اور کہا کہ یہ تو بنوغفار کا آدمی ہے، یہ تمہارا تجارتی راستہ بند کر دیں گے اور تم بھوکے مر جاؤ گے۔ بہرحال انہوں نے بیچ بچاؤ کیا اور واپس لے آئے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے اسی جرئت کا اظہار دوسری مرتبہ بھی کیا اور اسی طرح تکلیف دہ صورت حال سے دوچار ہوئے، پھر اپنے قبیلے میں تبلیغ دین کے واسطے فروکش ہو گئے۔ اور ایک زمانہ تک نہایت دلیری کے ساتھ اسلام کی اس اہم خدمت کو انجام دیتے رہے باوجودیکہ یہ کل تین آدمی تھے اور اس میں بھی تیسری آپ کی والدہ ایک بوڑھی عورت تھیں۔

غزوۂ تبوک میں شرکت:

جنگِ خندق کے بعد حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ تمام جنگوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہم رکاب رہے۔ ایک روز ایک فیصلہ کن جنگ کی تیاری ہونے لگی اور یہ جنگ تھی تبوک کی جو سن ۹ ہجری میں پیش آئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام سفروں میں سب سے زیادہ دشوار و زیادہ مشکل سفر تبوک کا تھا۔ حتی کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی اس کی شرکت میں زلت ہوئی جس کے واقعات عام طور سے مشہور ہیں۔ بہرحال اس غزوہ میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بھی شریک تھے۔ یہ چوں کہ امتحان اور جانچ کا موقع تھا، صحابہ رضی اللہ عنہم ایک دوسرے پر نظر رکھتے تھے کہ کوئی آنکھیں بچا کر نکل تو نہیں جاتا ہے، اتفاق سے ابوذر رضی اللہ عنہ ایک دن قافلوں والوں سے پیچھے رہ گئے، نگاہیں تو بکھری ہوئی تھیں، فوراً ایک ہنگامہ برپا ہو گیا کہ ابوذر رضی اللہ عنہ بھاگ گئے، بھاگ گئے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گوش اقدس تک جب یہ خبر پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سخت رنج ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی وفا شعار فطرت آئینہ کی طرح واضح تھی۔ آپ نے مدتوں کے تجربہ کے بعد یقین کر لیا تھا کہ ابوذر رضی اللہ عنہ کے سینہ میں جو دل ہے وہ کبھی ابوذر رضی اللہ عنہ کے پاؤں کو پیچھے لوٹا نہیں سکتا، لیکن آپ

مجبور تھے اس وقت صحابہؓ کی ان چہ میگوئیوں کا کیا جواب دیتے صرف اس قدر فرمایا: " چھوڑ دو، چھوڑ دو! اگر اس کی ذات میں کوئی بہتری ہوگی تو خداوند تعالیٰ خود تم لوگوں سے ملا دیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ گو زبان مبارک چپ تھی، لیکن دل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ تمنا تموج پذیر تھی کہ کاش ابوذرؓ ملنے میں جلدی کرتا اور لوگوں کو جو اس کی حالت سے بدگمانی ہوئی ہے وہ جلد دور ہو جاتی۔ آخر یہی ہوا کہ یکا یک حضرت ابوذرؓ کو ہوش آیا۔ آپ جو دیکھتے ہیں تو قافلہ غائب ہے، نہ صحابہ کرامؓ ہیں نہ وہ ہیں جن کو دیکھ لینے کے بعد ابوذرؓ پھر کسی چیز کو دیکھنا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ اپنے بچھڑنے کا انہیں احساس ہوا اور دل تھا کہ عجلت اور تیزی کی آرزوؤں میں ڈوب گیا، اونٹ کچھ تو قدرتا سست تھا، پھر نکیل کو ڈھیلی پا کر بہت زیادہ دھیما ہو گیا، آپ نے ایڑ لگائی، کوڑے لگائے؛ لیکن لوگ میلوں آگے نکل چکے تھے، ان کا چھو لینا دشوار ہو گیا، اور یہاں بے تابی حد سے گزر رہی تھی، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کیا جائے، آخر تھک کر آپ اونٹ سے اتر پڑے، جو کچھ سر پر سامان لاد سکے لاد لیا، اونٹ کو مع پالان وغیرہ کے وہیں چھوڑ کر دوڑتے ہوئے تلاش محبوب میں قدم بڑھانا شروع کیا۔ انجام کار ہانپتے کانپتے قافلہ کے قریب آ گئے، کسی صحابیؓ کی نظر پڑی کہ کوئی شخص پیادہ پا بعجلت تمام آرہا ہے۔ لوگوں کا خیال تھا ابوذرؓ تو اونٹ پر سوار ہیں، اس لئے یہ کوئی اور شخص ہے، فوراً غل ہوا کہ کوئی آرہا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی لوگوں نے اطلاع دی کہ جنگل میں کوئی اکیلا تن تنہا پیادہ پا آرہا ہے۔ غرض کہ ہر شخص کوئی آرہا ہے، کوئی آرہا ہے کی آواز بلند کر رہا ہے؛ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب دیکھا تو ارمان بھرے دل سے جو آواز نکلی آہ! وہ یہ تھی ۔۔۔۔۔ کن ابا ذر کن ابا ذر ۔۔۔۔ ابوذر ہی ہو، ابوذر ہی ہو۔ ان لفظوں میں کیا مسیحائی ہے؟ تم کو کیا معلوم؟ قتیلان ناز سے پوچھو! کہ اس کلمۂ اعجاز میں کتنی مٹے ہوئے کی جانیں پوشیدہ ہیں، اللہ اللہ، سر باختہ ابوذرؓ اپنی ہستی کو کھو بیٹھے تھے۔ جو اس طرح اپنی متاع کھوتا ہے وہ یوں ہی پاتا ہے اور لباسِ وجود دوبارہ اسے اسی طرح پہنایا جاتا ہے۔ سینہ کا داغ ہے وہ نالہ جو لب تک نہ گیا، خاک کا رزق ہے وہ قطرہ جو دریا نہ ہوا، نہیں ہو سکتا تھا کہ اِدھر سے یہ اعجازانہ الفاظ نکلیں اور دوسری طرف سے گم ہونے والا ابوذرؓ پھر پیدا نہ ہو، آخر یہی ہوا چند ہی منٹ کے بعد صحابہ میں غل ہوا کہ ابوذر ہی ہیں، ابوذر ہی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دل بھر آیا، یہ سنتے ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ابوذرؓ کی طرف رحم انگیز نگاہ ڈالتے ہوئے یہ الفاظ فرمانے لگے: رحم اللہ اباذر رضی اللہ عنہ یمشی وحدہ ویموت وحدہ ویبعث وحدہ. اللہ ابوذر پر رحم فرمائے، بے چارہ اکیلا چلتا ہے، اکیلا ہی مرے گا اور اکیلا ہی اٹھایا جائے گا۔ (حضرت ابوذرؓ غفاری:84)

حضور سے والہانہ محبت اور سفر شام:

نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دیرینہ خدمت اور سواری پر ردیف بننے کی سعادت بھی آپ کو متعدد مرتبہ حاصل

ہوئی۔جن صحابہ کرامؓ نے مختلف سوالات کے ذریعہ اپنے اور امت کے علم میں بے پناہ اضافہ کیا،ان میں حضرت ابوذر کا نام سرفہرست ہے۔حدیث پاک بیان کرنے کے دوران آپؓ کا طرزِ خاص تھا کہ آپ او صانی حبیبی یا او صانی خلیلی کی تعبیر اختیار کرتے،کبھی کبھی حالت بہت غیر ہوجاتی کہ حدیث بیان نہیں کرپاتے،گریہ طاری ہوجاتا تھا۔احنف بن قیس راوی ہیں کہ میں نے حضرت ابوذرؓ کو بیت المقدس کی مسجد میں ایک حدیث بیان کرتے ہوئے دیکھا،صرف اتنے الفاظ کہہ کر کہ مجھے میرے محبوب ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خبر دی،چیخ مارتے تھے،پھرلوٹاتے کہ مجھے میرے محبوب ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خبر دی اور چیخ مارتے پھر یہی کہتے کہ مجھے میرے محبوب ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خبر دی اور چیخ مارتے حتیٰ کہ چوتھی بار ضبط کرکے آپ نے روایت مکمل فرمائی۔(مسند احمد)رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتقال کے بعد آپ کی طبیعت کچھ ایسی مجروح ہوئی کہ مدینہ کی گلیاں اور بازار کاٹ کھانے کو دوڑتے۔نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تعلق رکھنے والی کوئی چیز دیکھتے تو بے اختیار ہوکر روتے۔اور اتنا روتے کہ بے حال ہوجاتے۔آخر آپ کی بیوی اُمّ ذر اور دوسرے لوگوں نے بھی مشورہ دیا کہ آپ مدینہ منورہ چھوڑ کر کسی اور جگہ چلے جائیں چنانچہ آپ شام کے علاقہ میں چلے گئے اور عرصے تک مقیم رہے۔

مال کے سلسلے میں حضرت ابوذرؓ کا مسلک:

اسلام کے ابتدائی عہد میں چونکہ غربت زیادہ تھی،اس لیے حکم دیا گیا تھا کہ ضروری اخراجات کے بعد باقی جو بچے وہ غریبوں کو دے دیا کرو لیکن بعد میں جب فراخی و وسعت کا زمانہ آیا تو پھر اللہ تعالیٰ نے سونے چاندی پر چالیسواں حصہ زکوٰۃ فرض فرما کر باقی اُنتالیس حصے صاحبِ مال کو عطا کردیے۔چنانچہ صحابہ کرامؓ مال میں سے زکوٰۃ ادا کرتے اور باقی مال اپنے تصرف میں لاتے؛لیکن حضرت ابوذرؓ اپنے اسی پرانے مسلک پر سختی سے کاربند رہے اور جب دوسروں کو مسئلہ بتاتے تو بھی یہی کہتے کہ جو ضرورت سے بچ رہے،وہ خدا کی راہ میں دے دو۔اس بارے میں وہ اپنے سے بڑے صحابہؓ کی مخالفت کی بھی پروا نہ کرتے،نہ ہی فتویٰ اور تقویٰ کا فرق ملحوظ رکھتے۔حالاں کہ فتویٰ اور چیز ہے اور تقویٰ اور چیز!چوں کہ حضرت ابوذر غفاریؓ اَجلہ صحابہ کرام میں تھے،بڑے عابد،زاہد،اور شب زندہ دار تھے،اس لیے پوری اُمت کے علاوہ صحابہ کرامؓ بھی ان کا احترام ملحوظ رکھتے اور ان کے مسلک کو لازمی نہ سمجھتے ہوئے بھی ان سے اُلجھنا پسند نہ کرتے۔ایسے ہی کسی معاملے کو لے کر آپ کا حضرت معاویہؓ سے اختلاف ہوگیا تو آپ نے حلفیہ کہا:جب تک معاویہؓ شام میں ہیں،خدا کی قسم!میں شام میں نہیں رہوں گا۔چنانچہ آپ دوبارہ مدینہ تشریف لائے۔اور حضرت عثمانؓ کے مشورے سے مدینہ منورہ سے چھ میل کے فاصلے پر مقام ربذہ میں قیام پذیر رہے اور ۳۱ یا ۳۲ ہجری میں یہیں انتقال فرمایا۔رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ

اصلاحی مضامین

بدشگونی اور اسلام

ازقلم: حضرت مولانا سید احمد ومیض ندوی مدظلہ *

اسلام دینِ توحید ہے، جو بندوں کو ہر طرح کی شرکیات سے نکال کر توحید کی روشنی میں لے آتا ہے، توحید اسلام کی اساس ہے، جس پر اسلامی تعلیمات کی عمارت کھڑی ہے، اسلام ہر اس فکر کی بیخ کنی کرتا ہے جس سے آدمی کا عقیدۂ توحید متاثر ہوتا ہو، وہ جہاں لوگوں کو شرک سے روکتا ہے وہیں شرک تک پہنچانے والے اسباب کو بھی جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ عقائد کے معاملہ میں اسلامی تعلیمات کسی طرح کی لچک نہیں رکھتیں، وہ اعمال کے بگاڑ کے مقابلہ میں عقیدہ کے بگاڑ کو کسی طرح برداشت نہیں کرتیں۔ انسانی زندگی پر توحید خالص کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ آدمی کو وہم وخیال کی دنیا سے نکال کر حقیقت وواقعیت کی طرف لے آتی ہے، اس کے برعکس شرک انسان کو طرح طرح کے توہمات میں مبتلا کر دیتا ہے، توحید پرست انسان کائنات میں مؤثر ذات صرف خدا کو خیال کرتا ہے، جب کہ شرک سے متاثر انسان کو مختلف چیزیں نقصان دینے والی نظر آنے لگتی ہے، توحید آدمی کو حقیقت پر نظر رکھنے والا بناتی ہے جب کہ شرک اس کو اوہام وخیالات کے خوفناک صحرا میں پہنچا دیتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد سے پہلے انسانیت شرک کے دلدل میں پھنسی ہوئی تھی، چنانچہ جزیرۃ العرب کے باشندوں میں ہزاروں قسم کے مشرکانہ عقائد جڑ پکڑ چکے تھے، شرک کے غیر معمولی اثرات کی وجہ سے وہ لوگ طرح طرح کے توہمات کا شکار تھے، وہ ہر دن کو سفر کے لیے موزوں نہیں سمجھتے تھے، اڑنے والا معمولی پرندہ انہیں بڑے سے بڑے کام سے روک دیتا تھا، نجومی کی من گھڑت پیشین گوئیوں پر یقین کرتے تھے، امراض کے متعدی ہونے کے قائل تھے، سفر یا تقریب کا ارادہ ہوتا تو پرندوں کو اڑاتے تھے، سیدھی جانب اڑتا تو سفر کرتے ورنہ سفر کو نامبارک سمجھ کر باز آجاتے تھے، الّو کے بارے میں ان کا تصور تھا کہ جہاں الّو پکارے وہ گھر برباد ہوتا ہے، ان کا خیال تھا کہ الّو انسان کی روح میں حلول کر جاتا ہے، اسی طرح جنات وشیطان کے سلسلہ میں طرح طرح کے توہمات کا شکار تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ جنات جنگلات میں مختلف شکلوں میں انسانوں کا راستہ بھلا دیتے ہیں، کنکریوں کے ذریعہ فال نکالنے کا بھی ان میں کافی رواج تھا، بارش کے سلسلہ میں وہ مختلف

* استاذ حدیث دارالعلوم حیدرآباد

نچھتروں کا حساب لگایا کرتے تھے اور بارش کے ہونے یا نہ ہونے میں انہیں کا دخل سمجھتے تھے، اسی طرح مختلف دنوں اور مہینوں کے بارے میں نحوست کا عقیدہ رکھتے تھے، ماہِ صفر کو منحوس سمجھتے تھے، وہ اس مہینہ کو بلاؤں اور مصیبتوں اور جنگوں کا مہینہ سمجھتے تھے۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جہاں جڑ پیڑ سے شرک کا خاتمہ فرمایا وہیں ان تمام شرکیہ اوہام اور خیالات کو بھی یکسر ختم کردیا جو انسان کو شرک سے قریب کرتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دورِ جاہلیت کے اس طرح کے تمام توہمات کی نفی فرمائی، چنانچہ ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرما: ''لا عدوی و لا طیرۃ و لا ھامۃ و لا صفر'' چھوت کوئی چیز نہیں، بدفالی بھی کوئی چیز نہیں، الّو کی نحوست کوئی چیز نہیں اور صفر کی نحوست کوئی چیز نہیں۔(بخاری) بدشگونی کا مطلب یہ ہے کہ آدمی آنے والے مصائب یا ناگہانی آفات کے سلسلہ میں خدا سے ہٹ کر کسی اور چیز کے مؤثر ہونے کا یقین کرے، جب کہ اچھے یا برے حالات لانے والی ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، یہ بات اس وقت پیدا ہوتی ہے جب عقیدۂ توحید متاثر ہوتا ہے، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بدشگونی کو شرک قرار دیا، چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''الطیرۃ شرک قالہ ثلاثا و ما منا إلا و لکن اللہ یذھبہ بالتوکل''(ابوداؤد، ترمذی)''بدشگونی شرک ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بات تین مرتبہ فرمائی، (پھر فرمایا:) ہم میں جو بھی ایسا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اپنے اوپر بھروسہ کرنے سے روکتا ہے۔'' اس حدیث میں بدشگونی کا ایک اثر یہ بتایا گیا کہ بدشگونی کرنے والا توکل سے محروم کردیا جاتا ہے، ایک دوسری روایت میں فرمایا: ''پرندوں سے فال نکالنا اور کنکریاں مار کر فال نکالنا اور بدشگونی لینا شیطانی عمل ہے'' (ابوداؤد) چوں کہ اس طرح خلافِ عقیدہ خیالات شیطانی وسوسہ کا نتیجہ ہوتے ہیں، اس لیے بدشگونی کو شیطانی فعل کہا گیا، حضرت عروہؒ تابعی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے بدشگونی کا ذکر ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: شگون کی اچھی صورت نیک فالی ہے اور یاد رکھو کسی مسلمان کو بدشگونی اس کے مقصد وارادہ سے باز نہ رکھے۔اور جب تم میں سے کوئی شخص ایسی چیز دیکھے جس کو وہ ناپسند کرتا ہو تو اس کو یہ دعا پڑھنی چاہیے: اے اللہ! آپ ہی بھلائیوں کے لانے والے ہیں اور آپ ہی برائیوں کو دفع کرنے والے ہیں، ہر طرح کی طاقت وقوت آپ ہی سے ہے۔(ابوداؤد) اس حدیث میں بدشگونی کے ایک عظیم نقصان کی طرف نشاندہی کی گئی ہے، وہ یہ کہ بدشگونی انسان کی عملی قوتوں کو مفلوج کردیتی ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تاکید فرمائی کہ کہیں تمہیں بدشگونی عزائم کے پورے کرنے سے نہ روکے، کسی دن یا مہینہ کو منحوس سمجھنا اور خدا کے علاوہ دوسری چیزوں میں نقصان یا ناکامی کا عقیدہ رکھنا آدمی کو عمل سے دور رکھتا ہے، چوں کہ جب انسان کے ذہن میں یہ خیال جڑ پکڑے کہ ہزار محنتوں کے باوجود وقت کی نحوست اس کو ناکام بنادے گی تو ظاہر ہے کہ وہ

محنت کیونکر کرسکتا ہے، چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ اس مرض کے شکار بہت سے افراد عموماً کسی بھی اقدام سے اس لیے ہچکچاتے ہیں کہ انہیں ناکامی کا احساس دامن گیر رہتا ہے، ایسے لوگ اکثر احساسِ کمتری کا شکار ہوکر کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام نہیں دے پاتے ہیں، اس کے برخلاف نیک شگونی کا مزاج آدمی کو عمل کے لیے آمادہ کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ نہ صرف نیک شگونی جائز ہے بلکہ مستحسن ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اکثر مواقع پر نیک شگون لیا کرتے تھے، حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اچھے ناموں سے فال نیک لیا کرتے تھے۔(مشکوٰۃ) حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جب کسی کام کے لیے باہر نکلتے تو آپ کو یہ اچھا معلوم ہوتا کہ کسی کی زبان سے یہ سنیں اے راشد! اے نجیح!(ترمذی) حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کسی چیز سے شگونِ بد نہ لیتے اور جب کسی عامل (کارکن) کو روانہ کرتے تو اس کا نام دریافت کرتے، اگر اس کا نام اچھا ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس سے خوش ہوتے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خوشی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے چہرۂ انور سے ظاہر ہوتی، اور اگر اس کا نام برا معلوم ہوتا تو اس سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ناگواری آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے چہرہ سے ظاہر ہوتی۔(یہ ناگواری فطری بات تھی نہ کہ بدشگونی کا اثر) اسی طرح جب کسی بستی میں داخل ہوتے تو اس کا نام دریافت کرتے، اگر اس کا نام اچھا معلوم ہوتا تو اس سے خوش ہوتے اور خوشی چہرہ سے ظاہر ہوتی اور اگر اس کا نام برا معلوم ہوتا تو اس سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے چہرۂ مبارک پر ناگواری ظاہر ہوتی۔(ابوداؤد) ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: بدشگونی بے حقیقت ہے، اس سے بہتر اچھی فال ہے، صحابہؓ نے عرض کیا کہ فال کیا چیز ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: وہ اچھا کلمہ ہے جس کو تم میں سے کوئی شخص سنے (اور اس سے اپنی مراد پانے کی توقع کرے)(بخاری، مسلم)

بدشگونی اور نحوست کا عقیدہ مشرک قوموں میں جڑ پکڑتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہندوانہ تہذیب میں یہ چیز بہت زیادہ پائی جاتی ہے، مسلمانوں میں ہندوانہ تہذیب کی جہاں اور بہت سی چیزیں جڑ پکڑیں وہیں ایک بدشگونی اور دنوں کو منحوس سمجھنے کی غیر اسلامی سوچ بھی ہے، اصلاحی اور دعوتی تنظیموں کی غیر معمولی محنت اور علماءِ امت کی انتھک جدوجہد کے باوجود اب بھی مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ ایسا ہے جو ماہِ صفر کو منحوس سمجھتا ہے، گوکہ زبان سے اس کا اظہار نہیں کیا جاتا لیکن عمل سے یہ بات پوری طرح آشکارا ہوتی ہے، ماہِ محرم کے آغاز سے ہی تقریبات موقوف کردی جاتی ہیں، محرم اور صفر میں نکاح یا دیگر تقریبات سے اس خیالِ باطل کی وجہ سے احتراز کیا جاتا ہے کہ ان کا انجام برا ہوگا، جہاں تک محرم کا تعلق ہے اس کو واقعۂ کربلا کی وجہ سے ماتم کا مہینہ سمجھا جاتا ہے، اور صفر کو منحوس سمجھنے کی وجہ سے اس میں کوئی اچھا کام نہیں کیا جاتا، اسی طرح شادی کی تاریخ طے کرتے وقت باقاعدہ مہینوں کا حساب لگایا جاتا ہے، پھر مخصوص اعداد وشمار کی روشنی میں دنوں کا حساب لگایا جاتا ہے، ہر دن کو

شادی کے لیے مناسب نہیں سمجھا جاتا، ماہِ صفر کی نحوست ثابت کرنے کے لیے بعض موضوع روایات کا بھی سہارا لیا جاتا ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں یہ روایت مشہور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو شخص مجھے صفر کے ختم ہونے کی خوشخبری دے میں اس کو جنت کی خوشخبری دوں گا، اس سے استدلال کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ چوں کہ صفر کا مہینہ منحوس ہے اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس شخص کو جو ماہِ صفر کے ختم ہونے کی اطلاع دے جنت کی خوشخبری دی، یہ ایک من گھڑت اور بے اصل روایت ہے جس کی صراحت ملا علی قاریؒ نے ''الموضوعات الکبیر'' میں کی ہے، ویسے اس کا بے اصل ہونا مفہوم سے بھی ظاہر ہے، جس ذات نے خود بدشگونی کے عقیدہ کا یکسر خاتمہ کیا وہ اس طرح کی بات کیسے کہہ سکتی ہے، پھر یہ کہ صفر کا مہینہ تو آخر ختم ہوگا ہی، محض اس کی اطلاع پر جنت کی بشارت دینا کیسے صحیح ہوسکتا ہے، بعض لوگ ماہِ صفر کے ابتدائی ۱۳؍دنوں کو بالخصوص منحوس سمجھتے ہیں، پھر ۱۳؍صفر کو تیرہ تیزی کے نام سے ایک رسم منائی جاتی ہے، اس کی شکل یہ ہے کہ ۱۲؍صفر کی رات کو خواتین اپنے سرہانے چند انڈے تیل، ماش کی دال رکھ کر سوتی ہیں اور ۱۳؍صفر کی صبح کو یہ چیزیں فقیروں میں تقسیم کی جاتی ہیں، ۱۳؍صفر کی صبح کو فقیر مختلف محلوں میں تیرہ تیزی کی آواز لگاتے پھرتے ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ ۱۳؍صفر کو بلائیں نازل ہوتی ہیں، اس لیے صدقہ کا اہتمام کرنا چاہیے، صفر کی ایک رسم جس کو بڑے دھوم سے منایا جاتا ہے، وہ آخری چہار شنبہ ہے، صفر کے آخری چہار شنبہ کو نہا دھو کر اچھے کپڑے زیب تن کیے جاتے ہیں، اور خواتین کسی پارک یا میدان میں ہریالی پر ٹہلنا ضروری سمجھتی ہیں، چنانچہ مختلف پارکوں اور بالخصوص زو پارک پر آخری چہار شنبہ کو عورتوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے، اس میں مرد و خواتین کا اختلاط ہوتا ہے، ان حضرات کا خیال ہے کہ اس دن رسول اکرم اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غسل صحت فرمایا تھا، جب کہ ماہِ صفر کے آخری ایام تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مرض الوفات کے ایام ہیں، ان دنوں میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیماری شدت کو پہنچی ہوئی تھی، لیکن بے شعوری کے عالم میں اس دن کو عید کی طرح منایا جاتا ہے، آخری چہار شنبہ کی رسم میں جو کچھ عقیدہ کا بگاڑ ہے وہ تو ہے ہی، اس کے ساتھ اخلاقی گراوٹ کا بھی مظاہرہ ہوتا ہے، جوان لڑکوں اور لڑکیوں کا اختلاط شرمناک حد تک بڑھ جاتا ہے، اس سے غیروں کو اسلام کے بارے میں مطعون کرنے کا موقع ہاتھ آتا ہے۔ ماہِ صفر میں جو کچھ کیا یا اس کے بارے میں جو کچھ سمجھا جاتا ہے، اس کے بارے میں بنیادی طور پر ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ ہماری ایمانی کمزوری اور اعتقادی بگاڑ کی علامت ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دورِ جاہلیت کی ان تمام غیر اسلامی اور مخالف توحید رسوم کا خاتمہ فرمایا تھا، پھر ان چیزوں کا زندہ کرنا گویا دورِ جاہلیت کی طرف لوٹنا ہے، کسی دن یا مہینہ کو برا بھلا کہنا دراصل اللہ کو برا بھلا کہنا ہے، اس لیے کہ دن ورات میں پیش آنے والے حالات کو دراصل اللہ تعالیٰ ہی لاتے ہیں، روایات میں زمانہ کو برا

بھلا کہنے سے منع کیا گیا ہے، چنانچہ حدیث قدسی میں رسول اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا ارشاد نقل فرمایا: ''زمانہ کو برا بھلا نہ کہو میں ہی زمانہ ہوں، دن ورات کو الٹ پلٹ کرتا ہوں''۔(بخاری ومسلم)

مسئلہ صرف ایک ماہِ صفر کا نہیں ہے بلکہ مسئلہ اس اعتقادی بگاڑ کا ہے جو امتِ مسلمہ میں سرایت کر چکا ہے، اعمال کا بگاڑ اتنا مضر نہیں ہوتا جتنا عقیدہ کا بگاڑ مضر ہے، عقیدہ کا بگاڑ شیطان کا وہ عظیم حربہ ہے جس کو استعمال کرکے وہ مومن کو گمراہی کی طرف لے آتا ہے، اعمال کے بگاڑ کی اصلاح ممکن ہے لیکن اعتقادی بگاڑ کی اصلاح اس لیے ممکن نہیں کہ آدمی اس کو صحیح اور حق سمجھ کر اختیار کرتا ہے۔امت کی معاشرتی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو ماہِ صفر سے ہٹ کر بیسیوں ایسی حرکتیں ملیں گی جو عقیدۂ نحوست اور بدشگونی کے تصور کی بنیاد پر کی جاتی ہیں، حضرت تھانویؒ نے ایسی بہت سی باتوں کا ذکر کیا ہے: بعض لوگ سفر کے وقت جھاڑو لگانے کو برا سمجھتے ہیں کہ اس سے سفر نامکمل ہوگا، بعضوں کا خیال ہے کہ کسی گھر پر الّو بولے گا تو اس پر مصیبت آئے گی، بہت سے گھرانوں میں منگل اور چہارشنبہ کو سفر کرنا برا سمجھا جاتا ہے، بعض خاندانوں میں تیسرے دن کے چاند دیکھنے سے منع کیا جاتا ہے اور ان کا عقیدہ ہے کہ اس سے نقصان ہوگا، بعض لوگ منگل کے دن ناخن اور بال نکالنے کو منحوس سمجھتے ہیں، اسی طرح بعضوں کے یہاں شعبان اور عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کے درمیان شادی کرنا مناسب نہیں سمجھا جاتا ہے۔

امت کی یہ صورتِ حال ان حلقوں کو فکر مند کرتی ہے جو اصلاحِ امت کا بیڑہ اٹھائے ہوئے ہیں، ایسے رسوم کے خاتمہ کے لیے ہر شخص کو حکمت وبصیرت کے ساتھ اپنے رشتہ داروں میں ذہن سازی کرنی چاہیے، خاندان میں جو کوئی صحیح علم رکھنے والا ہواُسے ضرور چاہیے کہ وہ اپنے قرابت داروں کو بدشگونی کے اعتقادی مفاسد سے آگاہ کرے، اسی طرح جن مہینوں کو منحوس سمجھ کر شادی بیاہ سے احتراز کیا جاتا ہے ان میں تقریبات کی جائیں، تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ نحوست بے اصل چیز ہے۔ نبی کریم ﷺ کی عقیدۂ توحید پر مبنی ٹھوس تعلیمات ہی کا اثر تھا کہ اسلام کے اولین معاشروں میں عقیدے کی کمزوری اور توہمات کا دور دور تک گذر نہ تھا، اور اس دور کے مسلمان وہم پرستی سے کوسوں دور تھے، حضرت زنیرہؓ ایک صحابیہ تھیں، قبول اسلام کی پاداش میں ظالموں نے ان پر ایسے مظالم ڈھائے کہ ان کی بینائی چلی گئی، جس پر ان کے مشرک رشتہ دار کہنے لگے کہ ہمارے دیوی دیوتاؤں کو تم نے برا کہا، جس کی وجہ سے تمہاری بینائی چلی گئی، حضرت زنیرہؓ نے اس قسم کے خیال کی سختی سے تردید فرمائی، اور کہا کہ یہ سب اللہ کے حکم اور فیصلے سے ہوا ہے، نبی رحمت ﷺ نے ان کی اس استقامت پر تعریف فرمائی، اور ان کے حق میں دعا فرمائی، جس سے ان کی بینائی لوٹ آئی۔خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب مصر فتح ہوا اور حضرت عمرو بن عاصؓ گورنر بن کر مصر پہونچے تو انھوں نے دیکھا کہ مصر کا دریائے نیل ہر

سال خشک ہوتا ہے، اور اس وقت تک جاری نہیں ہوتا جب تک ایک کنواری لڑکی کو بھینٹ نہ چڑھایا جاتا، حضرت عمرو بن عاصؓ کے گورنر بننے کے بعد جب یہی صورت پیش آئی، اور دریا خشک ہوگیا تو لوگوں نے انہیں کنواری لڑکی کو بھینٹ چڑھانے کی تجویز پر عمل کرنے کا مشورہ دیا، لیکن حضرت عمرو بن عاصؓ نے انکار کردیا، اور خط لکھ کر حضرت عمر فاروقؓ کو سارے احوال سے باخبر کیا، حضرت عمر فاروقؓ نے دریائے نیل کے نام ایک تحریر لکھی جس میں یہ درج کیا کہ اے دریائے نیل! اگر تو اللہ کے حکم سے بہتا ہے تو میری اللہ سے دعا ہے کہ تو جاری ہوجائے، اور اگر تو اللہ کے حکم سے جاری نہیں ہے تو تیری ضرورت نہیں، امیر المؤمنین کی ہدایت کے مطابق جونہی یہ تحریر دریا میں ڈال دی گئی دریا بہہ پڑا، اسی قسم کا ایک واقعہ قدیم زمانے میں ساحلی ہندوستان میں پیش آیا، جس کا تذکرہ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں کیا ہے، یہاں کے لوگ کافر تھے اور ہر ماہ سمندر کے کنارے ایک شیطان نمودار ہوتا تھا، لوگوں نے اس جگہ ایک بُت خانہ بنا رکھا تھا، اور شیطان کی آمد کی تاریخ کو لوگ ایک کنواری لڑکی کو بُت خانہ میں چھوڑ آتے تھے، صبح لڑکی کا کنوارا پن بھی ختم ہوجاتا تھا، اور وہ مردہ بھی پائی جاتی تھی، اس طرح وہ شیطان کے شر سے بچاؤ کرتے تھے، حسن اتفاق کہ اس علاقہ میں ایک مغربی مسلمان تاجر ابوالبرکات بربری پہونچے جو وہاں ایک بوڑھی خاتون کے گھر مہمان تھے، ایک دن جب وہ اپنی میزبان کے گھر پہونچے تو دیکھا کہ وہ رو رہی ہے، پوچھنے پر بتایا کہ شیطان سے بچاؤ کے لیے آج اس کی اکلوتی لڑکی کے حق میں قرعہ نکلا ہے، شیخ ابوالبرکات کو داڑھی نہ نکلی تھی، انھوں نے کہا کہ آج اس کی لڑکی کی جگہ میں جاؤں گا، چنانچہ رات کو وہ بُت خانہ میں جا کر بیٹھ گئے، اور رات بھر قرآن کی تلاوت کرتے رہے، صبح کو جب لوگوں نے دیکھا کہ وہ زندہ سلامت ہیں تو حیران و ششدر رہ گئے، اور یہ واقعہ سارے علاقہ میں پھیل گیا، بالآخر وہاں کے راجہ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے شیخ سے وعدہ کیا کہ آئندہ ماہ اگر ایسا ہوا تو وہ اسلام قبول کرلے گا، چنانچہ اگلے ماہ اسی طرح شیخ بت خانہ میں جا کر بیٹھ گئے اور انہیں کسی قسم کا نقصان نہ پہونچا، یہ منظر دیکھ کر راجہ اپنی رعایا کے ساتھ مسلمان ہوگیا، اسلامی تاریخ میں اس قسم کے واقعات بکثرت پائے جاتے ہیں، قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں میں توہمات اور اعتقادی کمزوری کا تصور بھی ممکن نہیں تھا، لیکن موجودہ مسلم معاشروں پر افسوس ہوتا ہے کہ ان میں طرح طرح کے توہمات جڑ پکڑتے جارہے ہیں، گھروں کی تعمیر میں غیر مسلموں کی طرح واستو کا لحاظ کیا جانے لگا ہے، نئے گھر میں منتقلی سے پہلے جانور کے خون بہانے کو ضروری خیال کیا جاتا ہے، رشتوں میں تاخیر یا لگاتار بیماریوں کی صورت میں مکان تبدیل کیا جارہا ہے، اور یہ عقیدہ رکھا جاتا ہے کہ گھر کی نحوست کی وجہ سے یہ سب کچھ ہورہا ہے، کاروبار میں نقصان کو لوگوں سے منسوب کیا جاتا ہے کہ فلاں نے کرتوت کروائے ہیں، جس سے

ہمارے کاروبار کو نقصان پہونچ رہا ہے، اسلامی عقیدہ میں ایسی تمام وہم پرستیوں کی قطعی گنجائش نہیں ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلم معاشرہ کو اسلامی تعلیمات سے آگاہ کیا جائے، اور ایمان کی پختگی کی تلقین کی جائے، اور یہ واضح کیا جائے کہ توہم پرستی کا اسلام سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔

قارئین اشرف الجرائد متوجہ ہوں!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

قارئین کرام! آپ حضرات کے دینی وعلمی ذوق کی برکت سے بفضلہ تعالیٰ ادارہ اشرف العلوم حیدرآباد کا ترجمان، کتاب وسنت اور اسلافِ امت کی تعلیمات کا علم بَردار ماہنامہ ''اشرف الجرائد'' بہ پابندی شائع ہو رہا ہے اور مارچ ۲۰۲۴ء تک آپ کی خدمت میں بذریعہ ڈاک ارسال کیا جاتا رہا۔ اللہ پاک اس ماہنامہ سے استفادہ اور افادہ کے سلسلہ کو قائم رکھے۔ اور ہماری صلاح وفلاح کا ذریعہ بنائے۔ آمین

بعض ممبران کو ماہنامہ بہ سہولت موصول ہوتا رہا، جب کہ اکثر ممبران کو ماہنامہ موصول نہ ہونے کی مسلسل شکایت رہی، آپ نے بھی اور ادارہ نے محکمۂ ڈاک سے وجوہات جاننے کی کوشش کی تاہم کوئی معقول جواب نہ ملا، ظاہراً محکمۂ ڈاک کی لاپروائی اور بے توجہی معلوم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔ نیز طباعت کے گراں بار مصارف اور کچھ قانونی مسائل ماہنامہ کی طباعت روک دینے کا سبب ہیں۔

اس لئے ادارہ نے یہ طئے کیا ہے کہ ماہنامہ حسبِ سابق تیار کر کے خواہش مند ممبران کو واٹس ایپ کے ذریعہ ارسال کر دیا جائے، چناں چہ اپریل ۲۰۲۴ سے اس پر عمل جاری ہے، آپ حضرات اپنے واٹس ایپ نمبر سے ادارہ کو 9866619359 نمبر پر میسیج کر دیں تو ماہنامہ گروپ کا لنک آپ کو بھیج دیا جائے گا آپ اس لنک کے ذریعہ گروپ میں شامل ہو سکتے ہیں۔ ازمرتب

اصلاحی مضامین

بنتِ حوا کا وقار حجاب میں!

از: مولانا محمد عمر قاسمی کاماریڈی*

”حجاب“ صرف اسلامی شعار اور مذہبی فریضہ ہی نہیں؛ بلکہ عزت وناموس کا محافظ، تحفظِ شرم وحیا کا ضامن، فطرتِ نسواں کا متقاضی، انسدادِ فواحش کا باعث، پاک باز اور عزت مآب خواتین کا وقار ومتانت، بے حیائی و بدکاری کی روک تھام کا مؤثر اور بہترین ذریعہ، جوہرِ عفت وعصمت کا پاسباں، بدقماش اور شرپسند بھیڑیوں اور ہوس پرستوں سے ڈھال اور سپر، اور پاک دامن و بدکردار کے مابین حدِ فاصل ہے؛ مختصر یہ کہ ”حجاب“ فطرتِ نسوانی اور رمزِ مسلمانی ہے، تہذیب وشائستگی کی بنیاد اور عظمت کی نشانی ہے؛ کیوں کہ

اسلام میں ہر طرح بجا ہے پردہ
نسواں کے لیے حسن وحیا ہے پردہ
پردے کی حقیقت میں وہ عظمت ہے رفیقؔ
خالق نے بھی خلقت سے کیا ہے پردہ

اسلام میں حجاب کا مقام اور مقصد!

اسلام میں حجاب کا مقصد خواتین کو تحفظ فراہم کرنا ہے نہ کہ قید کرنا؛ یہی وجہ ہے کہ جذبات واحساسات اور اخلاق وکردار کو آوارگی سے بچائے رکھنے، تہذیب وتمدن کو زوال وسقوط سے محفوظ رکھنے، معاشرتی برائیوں کا سدباب کرنے، اور خانگی زندگی کو خوش گوار اور کام یاب بنانے میں حجاب کا اہم کردار رہا ہے، عقل اور قیاس کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ جو شئ جتنی قیمتی ہوتی ہے اس کو اتنا ہی چھپا کر رکھنا چاہیے، نہ کہ اسے سڑکوں پر برسرِ عام نکالا جائے، اور لوگ اس سے مستفید ہو؛ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے عورت کے لئے اجتماعی نماز کے بہ نسبت انفرادی نماز کو ترجیح دی ہے، اور یہ سب صرف جوہرِ عفت کے تحفظ کی خاطر ہے۔

ہندو دھرم میں حجاب کا تصور!

حجاب کا یہ تصور صرف اسلام ہی میں نہیں ہے؛ بلکہ ہندو دھرم میں بھی حجاب کا تصور پایا جاتا ہے، ان کی مذہبی کتب اور جوتشیوں کی زندگی سے واضح ثبوت ملتا ہے؛ جیسا کہ ”سری کرشن کے ماموں کنشن متھرا کے راجہ

* فاضل دار العلوم دیوبند

نے جب کشتی کا دنگل قائم کیا تو مستورات کے دیکھنے کے لئے خاص مکانات بنوائے تھے، وہ اتنی بلندی پر تھے کہ راجہ ہنس اڑتے ہوئے نظر آتے تھے ان پر باریک جالی لگائی گئی تھی ، جہاں سے خواتین تماشہ دیکھتی تھیں"۔(مہابھارت: وشوپرب ادھیائے ۱۹)

فرقہ پرستوں کی سازش!

ہمارا وطنِ عزیز گنگا جمنی تہذیب سے جانا پہچانا جاتا ہے؛ لیکن افسوس کہ چند سالوں سے ہمارے ملک عزیز کی سیاست اور راجنیتی دھرم اور مذہب کے اردگرد ہی گھوم رہی ہے، موقع موقع سے اسلامی تعلیمات پر انگشت نمائی کرنے کی سازشیں رچی جاتی ہیں، چند ماہ قبل ہی ہماری پڑوسی ریاست کرناٹک میں حجاب کا مسئلہ اٹھا کر سیاسی کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کی گئ ، پھر اس کے بعد راجستھان میں بھاجپا لیڈر نے اسکول میں مسئلۂ حجاب کا شوشہ اٹھایا؛ ہنگامہ برپا کرکے لوگوں کو اسی میں مصروف رکھا جاسکے؛ حالاں کہ وہ خود زعفرانی پوشاک اور دھارمک لباس زیب تن کرکے ہر جگہ گھومتے ہیں؛ حتیٰ کہ پارلیمنٹ اور اسمبلی میں بھی وہی مخصوص لباس پہن کر جاتے ہیں اور اگر مسلم طالبات یونیفارم کے ساتھ حجاب اور برقع پوش ہوکر اسکول آئے تو انہیں گوارا نہیں، یہ کیسا دوغلا پن ہے؟ یاد رکھنا چاہیے کہ سیاسی لیڈران اور فرقہ پرستوں کا مذہبی معاملات اور حجاب وغیرہ کو تنازعی شکل دے کر پیش کرنا دراصل سیاسی مفادات کا حصہ اور مسلم دشمنی کا نشان ہے، سچ تو یہ ہے کہ یہ سب فرقہ پرست طاقتوں کی سوچی سمجھی سازش ہوتی ہے؛ کیوں کہ انہیں نہ تو زعفرانی رومال سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہی حجاب سے کوئی سروکار؛ بلکہ ان کا مقصد اور مدعا صرف اپنے سیاسی مفاد کے لیے ہندو مسلم کولڑا کر اپنی کرسی کو بچانا اور حکومت کرنا ہے، ملک میں زہریلی ہوا چلانا اور نفرت کی فضا پھیلانا ان کا خاص مشغلہ ہے، ملک کو تباہ و برباد کرنا، اس سونے کی چڑیا کو مٹی کی گڑیا بنانا، جمہوریت اور سیکولرازم کا خون کرنا، عوام کولڑا کر اصل مقصد سے توجہ ہٹانا ہے؛ کیوں کہ اب تو الیکشن کا زمانہ قریب ہے، اور عوام کو الجھانے اور ہندو مسلم کولڑانے کے لئے حجاب کا مسئلہ اٹھایا گیا؛ ورنہ تو یہ کوئی اختلافی مسئلہ ہے ہی نہیں، اور ان کا اصل ٹارگٹ تو اسلام اور اہلِ اسلام کو اس ملک سے ختم کرنا ہے؛ جیسا کہ آئے دن برسرِ اقتدار حکومت کے بعض نیتاؤں کی زہریلی زبانیں اس جانب مشیر ہے۔

کرنے کے اہم کام:

(۱) اسلام کی مکمل تابع داری: ہم اسلامی تعلیمات کو پڑھیں، منشاء شریعت کو سمجھیں، مکمل طور پر عملی زندگی میں داخل کریں، خواہشات کو چھوڑیں، اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہ کریں۔

(۲) اغیار کی نقالی سے بچیں: ہماری صورت حال تو یہ ہے کہ اکثر معاملات میں غیروں کی نقالی کے

عادی ہو گئے، غیروں کے خوشی کے مواقع پر تو مسلم اور غیر مسلم میں امتیاز کرنا دشوار ہو جاتا ہے؛ حالاں کہ یہ سخت ترین گناہ ہے۔

(۳) تعلیم اور ایجوکیشن کو فروغ دیں: آج ہماری بحالی کی ایک اہم سبیل اور علاج یہ کہ ہم تعلیم کو فروغ دیں، تعلیم اور ایجوکیشن پر زور دیں؛ ورنہ تو اندھیرا ہی اندھیرا نظر آئے گے۔

(۴) صحابیات کی سیرت پڑھیں: امتِ مسلمہ کے لئے معیارِ ایمان صحابہ کرامؓ ہیں، اپنے اندر صحابہ کرامؓ جیسی دینی حمیت اور ایمانی غیرت پیدا کر دیں، صحابیات کی پاکیزہ اور حجابی زندگی کو پڑھیں، شرعی برقع زیب تن کریں، اپنی عزت و آبرو کی خاطر چمک دمک اور فیشن کی قربانی دیں۔

(۵) ہنگامی حالات میں حدود میں رہ کر اقدام اور احتجاج کریں: مخالف حالات کا پیش آنا امرِ بدیہی ہے؛ لیکن اطمینان اور سنجیدگی سے سوچ کر حل نکالیں، اور حدود میں رہ کر ایسے اقدامات کریں، جو مؤثر بھی ہوں اور مفید بھی، صرف جذبات میں فیصلہ کرنے کے بعد ٹھنڈا پڑ جانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا؛ لہٰذا سوچ سمجھ کر سنجیدگی سے قدم اٹھائیں۔

(۶) اپنی اولاد کی فکر کریں: انسان کا صرف خود اچھا عمل کرنا کافی نہیں ہے؛ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے بال بچوں اور آل و اولاد کی اچھی تربیت کرے؛ کیوں کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے زیر اثر لوگوں کے بارے میں جواب دہ ہے۔ (بخاری: ۴۹۰۴)

پیغام!

سلام ہے قوم کی ان باہمت و جرأت مند بہنوں اور ماؤں کے نام! جو مذہبی آزادی اور اسلامی شعار کے تحفظ کی خاطر سراپا احتجاج ہیں، اور وقت کے ظالم و جابر فرعون و نمرود کی تانا شاہی کے زیر اثر آنے اور مخلوق کی بات مان کر خالق کی نافرمانی کرنے سے باز ہیں، اور قانونی دائرہ میں رہتے ہوئے پوری ہمت و شجاعت کے ساتھ فرقہ پرست آوازوں اور نعروں کو دبانے اور مذہبی آزادی کی حصول یابی کے لئے میدان میں کھڑی ہیں، اور منہ توڑ جواب دے کر حضراتِ صحابیاتؓ کے جذبۂ ایمانی کی یاد تازہ کر دی، اور زبانِ حال گویا ہیں کہ

ہے گل کے لئے رنگت، رنگت کے لیے پردہ
سیرت کے لئے صورت، صورت کے لئے پردہ
کیا خوب بنایا ہے ستار حقیقی نے
پردے کے لیے عورت، عورت کے لیے پردہ

اصلاحی مضامین

اللہ کو پانے کا آسان راستہ

از: مولانا مفتی محمد سلمان قاسمی محبوب نگری*

انسان کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ وہ دنیا کی لذتوں اور آسائشوں سے تنگ وملول ہو کر آخرت سے اپنا تعلق جوڑنا چاہتا ہے، اپنے حقیقی محبوب اللہ کو پانا چاہتا ہے، اپنے مالک تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے اور جس کسی انسان کے دل میں یہ خیال گزرے تو اول وہلہ میں اس کا ذہن اسی امر کی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ اللہ کو پانے کے لیے خوب عبادت و بندگی کرنی ہوگی، صوم وصلوٰۃ کی پابندی، نوافل واذکار کا خوب اہتمام اور معاصی سے کلی احتراز کے ساتھ اپنے اوقات کو دنیا کی رعنائیوں میں برباد کرنے کے بجائے امورِ اُخرویہ میں صرف کرنا ہوگا، یقیناً یہ ساری چیزیں خدا تک پہنچنے کا وسیلہ ہیں لیکن اس کے علاوہ بھی ایک راستہ اور طریقہ ہے جس کے ذریعے بندہ بآسانی اللہ کا محبوب اور مقرب بن جاتا ہے؛ وہ راستہ کیا ہے؟ خلق خدا کے ساتھ مہربانی؛ ایک کہاوت زباں زد خاص و عام ہے" عبادت سے جنت ملتی ہے اور خدمت سے خدا ملتا ہے" اور اللہ پاک نے انسان کے اندر جو جذبات واحساسات کا مادہ رکھا ہے اس کا ایک اہم سبب انسان کے اندر جذبۂ خدمت کو اجاگر کرنا اور مخلوق کے ساتھ ہمدردی پر آمادہ کرنا بھی ہے؛ خواجہ میر خوردؔ کی زبان میں:

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّ وبیاں

طبرانی کی ایک روایت ہے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مخلوق ساری کی ساری اللہ کا کنبہ ہے اور اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب شخص وہی ہے جو اس کے عیال کو زیادہ سے زیادہ نفع پہنچانے والا ہو، یہاں عیال سے مراد حقیقی عیال نہیں کیوں کہ اللہ کی شان "لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ" ہے، بلکہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح انسان کو اس کا اپنا خاندان عزیز ہوتا ہے ایسے ہی مخلوق اللہ تعالیٰ کو عزیز و پیاری ہے، بیوی بچوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے پر جس طرح مرد خوش ہوتا ہے ایسے ہی اپنی مخلوق کی نفع رسانی کرنے والوں کو اللہ بھی پسند فرماتے ہیں، ایک اور حدیث میں ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے دن فرمائیں گے اے ابن آدم! میں بیمار

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

تھا تو نے میری عیادت نہیں کی تو بندہ کہے گا اے میرے رب! میں آپ کی عیادت کیسے کروں جب کہ آپ ربُّ العالمین ہیں تو اللہ پاک فرمائیں گے کیا تم کو معلوم نہیں میرا فلاں بندہ بیمار تھا، تم نے اس کی عیادت نہیں کی، اگر تم اس کی عیادت کرتے تو اس کے پاس مجھے پاتے، پھر اللہ کہیں گے اے ابن آدم! میں نے تم سے کھانا طلب کیا تم نے مجھے نہیں کھلایا تو بندہ کہے گا میں آپ کو کیسے کھلاتا جب کہ آپ سارے جہانوں کے پروردگار ہیں تو اللہ فرمائیں گے میرے فلاں بندے نے تم سے کھانا مانگا تھا، تم نے اس کو کھانا نہیں کھلایا، اگر تم اس کو کھانا کھلاتے تو اس کے پاس مجھے پاتے پھر اللہ کہیں گے میں نے تم سے پانی مانگا اور تم نے مجھے پانی نہیں پلایا تو بندہ کہے گا اے اللہ! میں آپ کو کیسے پلاتا جب کہ آپ سارے عالموں کے رب ہیں تو اللہ پاک فرمائیں گے میرے فلاں بندے نے تم سے پانی مانگا اگر تم اس کی پیاس بجھاتے تو اس کے پاس مجھے پاتے۔ (صحیح مسلم)

اس طویل حدیث کا حاصل یہ ہے کہ بندہ جب خلقِ خدا کے ساتھ مہربانی کا معاملہ کرے گا، ان کی ضروریات کا تکفل کرے گا تو ان اعمال کی برکت سے اللہ کی خوشنودی حاصل کر سکے گا، مزید برآں خدا کی رحمتِ خاصہ کا مستحق قرار پائے گا، خود رب العالمین اس کی طرف نظرِ عنایت فرما کر اس کے سارے امور میں مدد فرمائیں گے جیسا کہ آپ علیہ السلام نے فرمایا جو کوئی اپنے مسلمان بھائی کی ضرورت پوری کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کرے، اللہ پاک اس کی ضروریات کی تکمیل فرمائیں گے نیز فرمایا جو کوئی مسلمان بھائی کی مدد میں لگا رہے گا اللہ پاک ایسے بندے کی اپنی (رحمت سے) مدد فرمائیں گے، خلقِ خدا کی خدمت کا صرف یہی مطلب نہیں ہے کہ اس کو کھلایا جائے، پلایا جائے، صدقہ وخیرات کے ذریعے اس کی مدد کی جائے بلکہ کسی مصیبت زدہ شخص کی مدد کرنا اور اس پر افتادِ مصیبت و پریشانی کو دفع کرنا بھی خدمت خلق کے قبیل سے ہے اور ایسے لوگوں کے بارے میں بھی احادیث میں فضیلت وارد ہوئی ہے؛ آپ علیہ السلام نے فرمایا جو کوئی کسی مسلمان کی دنیاوی مصیبت کو ہٹائے گا اللہ پاک اس کو دنیاوی و اخروی مصیبتوں سے نجات عطا فرمائیں گے، نیز اگر کوئی صاحبِ معاملہ یا باحیثیت انسان ہو اور اس کو کسی پر اختیار حاصل ہو جیسے کسی نے اس سے قرض لیا ہو یا اجرت و کرایہ دینا باقی ہو، اور وہ شخص قرض و کرایہ بالکل ادا کرنے کے قابل نہ ہو، یا فی الحال کے لیے عاجز ہو تو اس کے قرضے و کرایے کو معاف کرنا یا اس کو کشادگی تک کے لیے مہلت دینا بھی ایک طرح کی انسانی ہمدردی ہے اور اس کے ذریعے بھی انسان اللہ کے انعام کا مستحق ہوتا ہے، جیسا کہ اسی حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے آگے فرمایا کہ جو شخص کسی تنگدست پر آسانی کرے گا اللہ پاک دنیا و آخرت میں اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ فرمائیں گے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ایسے لوگوں کو پسند فرماتے تھے جو لوگوں کی راحت رسانی کے لیے کوشاں ہوں، چنانچہ ایک مرتبہ حضرت

علی رضی اللہ عنہ آپ علیہ السلام کے فضائل بیان کرتے ہوئے کہنے لگے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اطراف بہت لوگ ہوتے تھے مگر ان میں آپ کے نزدیک زیادہ صاحب فضیلت وہی ہوتا تھا جو عام لوگوں کی زیادہ بھلائی چاہتا ہو، اور آپ کے نزدیک زیادہ صاحب مرتبہ وہی ہوتا جو لوگوں کے دین اور دنیا کے امور میں کام آئے، اور ان کے ساتھ محبت واخلاص سے پیش آئے، مخلوق کی راحت رسانی کرنے والے کو آپ نے عند اللہ سب سے محبوب قرار دیا، چنانچہ ایک مرتبہ ایک شخص آپ علیہ السلام کی خدمت میں آکر عرض کرنے لگا کہ یا رسول اللہ! اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ شخص کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ شخص وہی ہے جو لوگوں کو زیادہ نفع پہونچانے والا ہو یا لوگوں کی پریشانی کو ہٹاتا ہو یا قرض کو ادا کرتا ہو یا ان کی بھوک کو ختم کرتا ہو؛ (مزید آپ نے فرمایا) میں اپنے کسی بھائی کی حاجت برآری کے لیے چلوں پھروں یہ میرے نزدیک اس مسجد (مسجد نبوی) ایک ماہ اعتکاف کرنے سے زیادہ پسندیدہ ہے، اللہ اکبر!

حضرات صحابہؓ نے آپ کے ان جذبات کی کامل کی قدر کی، اور اپنی زندگی میں اس کا عملی ثبوت امت کی راہنمائی کے لیے چھوڑ کر گئے؛ چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بارے میں مروی ہے کہ وہ اعتکاف میں بیٹھے ہوئے تھے، پھر وہ اعتکاف چھوڑ کر چل پڑے تاکہ لوگوں کی ضروریات کو پورا کرسکیں، اور آپ علیہ السلام کا فرمان نقل کیا کہ جو کوئی اپنے بھائی کی حاجت روائی کے لیے کوشش کرے گا وہ اس کے لیے دس سال کے اعتکاف سے زیادہ بہتر ہے اور جو کوئی اللہ کی رضا پانے کے لیے ایک دن کا اعتکاف کرے تو اللہ پاک اس کے اور جہنم کے بیچ تین خندقیں حائل کردیتے ہیں، جن میں سے ہر دو کے بیچ مشرق ومغرب کے درمیان کا فاصلہ ہوگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں قصہ مشہور ہے کہ آپ راتوں کو اٹھ کر بیواؤں اور کمزور بوڑھیوں کے گھروں کو جاتے اور انکی ضروریات پوری کرتے اور انکی پریشانیوں کو دور کرتے تھے۔

سلف صالحین نے حضرات صحابہؓ کی کامل پیروی کی، خدمت خلق کے باب میں ذرا سا بھی تخلف نہیں کیا۔

امام بخاریؒ کے شیخ حضرت عبداللہ بن عثمانؒ نے فرمایا کہ جو کوئی میرے پاس اپنی کسی حاجت کو لے کر آئے تو میں خود اس کی مدد کے لیے نکلتا ہوں، اگر اس کی مدد کرنا میرے بس کی بات نہ ہوتی تو میں محض اس کی مدد کی خاطر بادشاہ سے مدد طلب کرتا ہوں۔

ابن رجب رحمہ اللہ نے بعض سلف سے نقل کیا ہے کہ ابو وائل رحمہ اللہ ہر روز محلے کی عورتوں اور بوڑھیوں کے گھروں کا چکر لگاتے اور ان کی ضروریات کی چیزیں خرید کر انہیں فراہم کرتے تھے۔

ایک واقعہ منقول ہے کہ ایک شخص جہاد میں ایک جماعت کے ساتھ شریک ہوا اور اس نے تمام لشکریوں

کے ساتھ یہ معاہدہ کیا اور شرط رکھی کہ سفر میں وہی ان کی خدمت کرے گا، اب دوران سفر کوئی شخص اپنے سر کو یا کپڑوں کو دھونے لگتا تو یہ فوراً آگے بڑھ کر ان کو روک دیتا اور ان کا اتنا معمولی کام بھی خود انجام دیتا، اگر وہ لوگ تخلف کریں تو کہہ دیتا کہ میں نے پہلے ہی شرط رکھی تھی کہ آپ لوگوں کی خدمت میں کروں گا۔ لوگ کہتے ہیں کہ جب اس کا انتقال ہوا تو لوگوں نے اس کی کھال اور گوشت کے بیچ ہاتھ پر لکھا ہوا پایا "من اهل الجنه" یعنی یہ شخص جنتی لوگوں میں سے ہے۔

محمد بن واسع رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے کبھی بھی کسی ضرورت مند کو واپس نہیں کیا جس کی مدد کرسکتا ہوں اگر چہ اس کی مدد میں میری ساری دولت ختم ہوجائے؛ محمد بن سکندرؒ فرماتے ہیں کہ دنیا کی زندگی میں اگر کچھ لذت باقی ہے تو وہ لوگوں کی مدد کرنے میں ہے۔

حسن بن رباحؒ ایک صاحب فضیلت بزرگ تھے، ان کے پاس ایک شخص آیا تاکہ آپ اس کی کسی معاملہ میں سفارش کریں تو آپ نے اس کی سفارش کردی پھر وہ شخص آکر آپ کا شکریہ ادا کرنے لگا تو آپ نے فرمایا کس بات کا شکریہ ادا کررہے ہو؟ (یہ تو میرا ذمہ تھا) ہم سمجھتے ہیں کہ جس طرح مال کی زکوٰۃ ہوتی ہے ایسے ہی مرتبہ کی بھی زکوٰۃ ہوتی ہے جس سے صاحب مرتبہ دوسروں کے کام آسکے؛ عبداللہ بن مبارکؒ سے ایک شخص نے دریافت کیا اے ابو عبدالرحمن! میرے دو گھٹنوں میں ایک پھوڑا ہو گیا ہے، پچھلے سات سالوں میں میں نے اس کا کئی طرح سے علاج کیا، کئی اطباء سے ملاقات کی پھر بھی مجھے فائدہ نہیں ہوا تو حضرت ابن مبارکؒ نے فرمایا فلاں جگہ پر جاؤ جہاں لوگوں کو پانی کی ضرورت ہے، وہاں ایک کنواں کھودو، مجھے امید ہے کہ وہاں ایک چشمہ بہے گا اور یہاں تمہارا خون رکے گا۔ اس شخص نے ایسا ہی کیا تو اللہ نے اس کی برکت سے اس کو زخم سے شفا دیدی۔

ان واقعات کا حاصل بس یہی ہے کہ خلقِ خدا کی حاجت روائی اور خدمت گذاری ایک بہترین عبادت ہے، اللہ کے بندوں پر مہربان بندے پر خدا بہت جلد مہربان ہوتا ہے "الراحمون یرحمھم الرحمن" اس کے علاوہ دنیا و آخرت کے بیشتر منافع سے اس عملِ خدمتِ خلق کے ذریعہ انسان بہرہ ور ہوسکتا ہے، لہٰذا جو کوئی اللہ کا قرب و تعلق چاہتا ہو، خدا کی رضا اور رسولِ خدا کی خوشنودی کا طالب ہو تو اپنی استطاعت کے بقدر لوگوں کے کام آنے کی کوشش کرے، اس میں پیسہ ہی خرچ کرنا ضروری نہیں بلکہ دامے درمے سخنے جیسے بھی ممکن ہو اللہ کی مخلوق کو فائدہ پہنچائے، دیگر عبادتوں، ریاضتوں، مشقتوں اور مجاہدوں کے ذریعہ اللہ ملے یا نہ ملے یا گمان ہے کہ کچھ تاخیر ہوجائے لیکن یہ عمل تیر بہ ہدف ہے، اس راستہ سے ضرور اللہ تعالیٰ کی محبت اور قرب نصیب ہوگا بہ شرطیکہ اخلاص کے ساتھ کیا جائے۔

گوشۂ آزادی

جنگِ آزادی میں مسلمانوں کا کردار

از: مفتی محمد ثاقب قاسمی*

اگست 1947 کی تاریخ ہندوستان کی ایک یادگار اور اہم ترین تاریخ ہے، اسی تاریخ میں وطن عزیز ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے خلاصی ملی، تقریبا دوسو سال کی مسلسل قربانیوں اور جانفشانیوں کے بعد آزادی کا یہ دن نصیب ہوا، جانوں کا نذرانہ پیش کرنے اور سب کچھ لٹادینے کے بعد ہندوستان نے صبح آزادی کا مشاہدہ کیا۔ آزادی اللہ سبحانہ وتعالی کی ایک بہت بڑی نعمت ہے جبکہ غلامی رب کائنات کی طرف سے ایک عذاب ہے، اس آزادی کی خاطر ہمارے اسلاف، رہنما، قائدین اور مسلم عوام نے جانی و مالی قربانیاں پیش کیں، تحریکیں چلائیں، پھانسی کے پھندے پر چڑھے، تب کہیں جا کر انگریزوں کے ناپاک قدم سے ہمارا ملک پاک ہوا، انگریزوں نے ہند پر حکومت کرنے کے لیے طرح طرح کی چالیں چلیں، تدبیریں اختیار کیں، پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی کو اختیار کیا، ہندوستان کی عوام کو ہندو مسلم کے نام پر آپس میں لڑانے کی کوششیں کیں، ہمارے ملک کی گنگا جمنی تہذیب کو مسمار کرنے کی تدبیریں کیں؛ لیکن ان کی کوششیں رائیگاں ہوگئیں۔ الغرض ایک دن وہ آیا کہ ان لوگوں کو ہمارا ملک چھوڑ کر جانا پڑا، اس طرح ہندوستان ان کی غلامی سے آزاد ہوگیا۔ انگریز جب ہندوستان پہنچے تھے تو تاجروں کی حیثیت سے پہنچے تھے اور عام لوگوں نے انھیں ایک معمولی تاجر کے سوا اور کچھ نہیں سمجھا تھا؛ مگر شروع ہی سے ان کی نیت صاف نہیں تھی، انھوں نے اپنوں کی کمزوری اور آپسی نااتفاقی سے فائدہ اٹھا کر اپنی شاطرانہ اور عیارانہ چالوں کا استعمال کیا، اس طرح ہندوستانی قوم کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا، یہاں کی دولت وثروت کو لوٹا گیا، یہاں کے باشندوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گئے اور یہاں کی تہذیب وتمدن سے کھلواڑ کیا جانے لگا اور یہ سلسلہ مزید بڑھتا ہی گیا، یہاں تک کہ جب پانی سر سے اوپر ہوگیا، تو ہندوستانیوں کے دلوں میں آزادیٔ وطن کا جذبہ پیدا ہوا اور سب سے پہلے مسلمانوں نے اس خطرے کی سنگینی کو محسوس کیا، سراج الدولہ، سلطان ٹیپو شہید اور دیگر مسلم فرماں روا اپنی تمام تر قوتوں کے ساتھ جان ہتھیلی پر رکھ کر

* سیکریٹری مجلس احرار اسلام پنجاب

میدانِ جنگ میں کود پڑے اور یوں تحریک آزادی کی ابتداء ہوئی پھر یہ تحریک رکی نہیں بلکہ اس نے زور پکڑنا شروع کیا اور اب علماء ہند کفن باندھ کر انگریزوں کو للکارنے لگے اور یہ ایسی جماعت تھی جس کی جفاکشی، بلند ہمتی، صبر واستقلال، دوراندیشی اور ایثار وقربانی نے اس دور کی تاریخ کو انقلاب آفریں بنادیا۔

چنانچہ ان ہزاروں علماء کرام اور مجاہدین آزادی کی ایک لمبی فہرست ہے جنھوں نے آزادی کی خاطر ہر طرح کی قربانیاں پیش کیں اور قائدانہ رول ادا کیا، خصوصاً شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، شاہ اسحاق محدث دہلوی، مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی، مولانا اسمٰعیل شہید، مولانا عبدالحئی، مولانا قاسم نانوتوی، شیخ الہند محمود حسن دیوبندی، مولانا رشید احمد گنگوہی، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، مولانا فضل حق خیرآبادی، حافظ ضامن شہید، مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ، مولانا محمد علی جوہر، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ جیسے پیکر استقلال اور کوہ گراں پیدا ہوئے، جنھوں نے نہ صرف اپنی تقریروں اور تحریروں، بلکہ اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرکے آزادیٔ وطن کی بنیاد رکھی۔

انہی علماء کرام کی جلائی ہوئی مشعل کی روشنی میں 1857ء کی جنگ آزادی بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں لڑی گئی جس میں ہندوستان کے ہر فرقے کے لوگ شامل تھے، لیکن یہ جنگ ناکام ہوئی اور ناکامی کی قیمت سب سے زیادہ مسلمانوں کو چکانی پڑی، تقریباً دو لاکھ مسلمان شہید ہوگئے جن میں تقریباً باون ہزار علماء تھے، ان کی جائدادیں لوٹ لی گئیں، اس قدر جانی و مالی نقصان کے باوجود تحریک آزادی کا سلسلہ مختلف شکلوں میں جاری رہا اور بالآخر ہمارا ملک تمام اہلِ مذاہب، بالخصوص مسلمانوں اور اُن میں بھی علماء کرام کی جہد مسلسل اور اُن کی جانی ومالی قربانی کے بعد آزاد ہوا۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا کردار تاریخ میں ایک سنہرے باب کی حیثیت رکھتا ہے، یہ مسلمانوں کی حب الوطنی، جوش وولولہ اور ایثار وقربانی کی لافانی داستان ہے، تحریک آزادی میں مسلمانوں نے ایک بے مثال کردار ادا کیا اور مادر وطن کو انگریزوں کے پنجہ ٔغلامی سے آزاد کرنے کے لیے نہ صرف ناقابل بیان اذیتیں برداشت کیں، بلکہ جان ومال کی عظیم قربانیاں دینے سے بھی گریز نہیں کیا، میں یہ نہیں کہتا کہ صرف مسلمانوں نے ہی اس ملک کو آزاد کرنے میں مشقتیں اور محنتیں کی ہیں بلکہ ہمارے ملک کے ہندو، سکھ اور عیسائی بھائیوں نے بھی اس ملک کی آزادی میں اہم رول ادا کیا ہے، مہاتما گاندھی جی، پنڈت جواہر لال نہرو، رابندر ناتھ ٹیگور، اور شہید بھگت سنگھ کی قربانیاں بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہیں، لیکن بدقسمتی سے انگریزوں کی طرف سے اپنی حکومت بنائے رکھنے کے لیے اپنائی گئی divide and rule پالیسی کی وجہ سے جہاں تقسیم ہند کا سانحہ پیش آیا، وہیں ہندوستان میں موجود مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان مضبوط اتحاد کو

توڑنے اورنفرتوں کی خلیج وسیع کرنے کا موقع بھی ہاتھ آیا۔ ہندوستان میں بسنے والی ہندوستانی قوم جو کہ مختلف مذاہب، ذات اور ثقافتوں پر قائم ہوئی تھی آج ہمارا ملک اس منہج سے ہٹتا جارہا ہے، افسوس صد افسوس! اس وقت ہمارا ملک جس بحرانی دور سے گزر رہا ہے وہ ہم سب پر ظاہر وعیاں ہے، فرقہ پرست عناصر اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے نا قانون کا خیال کر رہے ہیں اور نا ہی انسانیت کے اصولوں کو مان رہے ہیں، اسلام اور مسلمانوں کو ہر ممکن نقصان پہنچا رہے ہیں۔ فرقہ پرست اور متعصب لوگ مدارس اسلامیہ اور مساجد ومسلمانوں کے خلاف ایک منظم تحریک چلائے ہوئے ہیں، مدارس، مساجد اور مسلمانوں کے کردار کو مسخ کیا جارہا ہے اور اسلامی تشخص کو ختم کرنے کی مہم میں زبردست شدت آئی ہوئی ہے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جب بھی جنگ آزادی کے مجاہدین اور شہیدوں کی بات ہوتی ہے تو مسلمانوں میں بس مولانا ابوالکلام آزاد اور شہید ٹیپو سلطان کا سرسری تذکرہ کر کے بات ختم کردی جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جنگ آزادی کی تاریخ کو فرقہ وارانہ رنگ دینے والوں نے مسلم انقلابیوں، شاعروں اور مصنفین کی جنگ آزادی میں حصہ داری کو جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آج کی نسل اس پہلو سے بالکل لاعلم ہے۔ اور منفی پروپگنڈے کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پائی جانے والی خلیج آئے دن وسیع ہوتی جارہی ہے۔

ہمارے اسلاف کی قربانیوں کو اسکول وکالج کے نصاب کی کتابوں سے نکالا جارہا ہے صرف ٹیپو سلطان اور مولانا ابوالکلام آزاد کی قربانی کے دو چند واقعات کے علاوہ دوسرے علماء کی قربانیوں کو نصاب میں جگہ نہیں دی جارہی ہے، تاریخ سے ہمارے نام ونشان کو مٹانے کی انتھک کوششیں کی جارہی ہیں، عصبیت کا تو یہ عالم ہے کہ دوسری قوموں کے مجاہدینِ آزادی کے نام کی سڑکیں، پارک، ہاسپیٹل اور اسکول تو تیزی سے بن رہے ہیں؛ لیکن ہمارے بزرگوں کے نام سے موسوم کچھ بھی بنانا گوارہ نہیں کیا جاتا، افسوس! حد تو یہ ہوگئی کہ ہمارے تاریخی مقامات کے ناموں کو بدلا جارہا ہے، ہمارے بزرگان دین کے نام سے موسوم تمام تر جگہوں اور چیزوں کے ناموں کو غیروں کا نام دیا جارہا ہے، ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اپنے ملک اور قوم کے ہیرو، ان مجاہدین کرام کو خراج عقیدت پیش کریں اور ان کی تاریخ اور کارناموں سے واقفیت حاصل کریں اور ان کے نقوش زندگی کو اپنے لئے مشعل راہ بنائیں۔

اخلاق وآداب

گھر کا دینی واخلاقی نظام العمل

از: ڈاکٹر عبدالکریم بکار صاحب شامی

والدین اس انتظار میں نہ رہیں کہ تربیت گاہیں ان کی اولاد کو اچھا شہری بنائیں گے، انہیں خود اس ذمہ داری کو پورا کرنا ہوگا کہ وہ اپنے بچوں کو معاشرے کا ذمہ دار فرد بنائیں۔

اچھا ہو کہ والدین گھروں میں کچھ ایسے ہلکے پھلکے قانون بنائیں جن پر عمل کر کے بچوں کے کردار میں پختگی آئے اور ان میں احساس ذمہ داری پیدا ہو۔

اس ضمن میں چند لوائح العمل: والدین کو جو مناسب لگیں وہ اختیار کریں یا ان میں ترمیم واضافہ کرلیں۔

1: گھر کا ہر فرد نماز وقت پر ادا کرے۔

2: ''جزاك الله'' کے کلمات بنیادی ضوابط ہوں گے جن سے کوئی بھی بری نہیں ہوگا۔

3: مار پٹائی، گالم گلوچ یا لعن طعن نہیں ہوگی۔

4: اپنے محسوسات اور خیالات ادب واحترام کے ساتھ بتائیے۔

5: جو جس چیز کو (دروازہ، کھڑکی، ڈبہ) کھولے گا اُسے بند بھی کرے گا۔ کچھ گر جائے تو اُسے اٹھائے گا اور صاف کر کے رکھے گا۔

6: آپ کا کمرہ خالص آپ کی ذمہ داری ہے۔

7: بات ٹوکے بغیر سنی جائے گی اور درمیان میں سے کوئی نہیں کاٹے گا۔

8: دوسروں کے سامنے اتنے دھیمے لہجہ میں ہرگز گفتگو نہیں کریں گے کہ کوئی سن نہ سکے۔

9: گھر کے بزرگ/والدین کوئی بات/مشورہ یا حکم دیں اسے ماننا ہوگا۔

10: گھر میں سلام کرنا ہوگا۔

11: گھر کا ہر فرد روزانہ قرآن مجید کی تلاوت کرے گا۔

12: جو ملنے آئے وہ قوانین کا احترام کرے۔

13: گھر کا کوئی بھی فرد کمروں میں کچھ نہیں کھائے گا۔

14: رات کو(10:00) کے بعد کوئی نہیں جاگے گا۔

15: فجر سے پہلے ہر بچے اور بڑے کو جاگنا ہوگا۔

16: سمارٹ فون اور ڈیوائسز 9am کے 9pm درمیان استعمال کی جاسکتی ہیں۔اور 15 منٹ کے مسلسل استعمال کے بعد 1/گھنٹے کا وقفہ ضروری ہوگا۔

17: والدین کا احترام ضروری ہوگا۔

18: مل کر بیٹھنے کا وقت طے کیا جائے گا کسی قسم کی مواصلاتی ڈیوائس (فون/پیڈ) کا استعمال منع ہوگا۔

19: کھانے کے وقت سب کی حاضری اور شمولیت ضروری ہوگی۔

20: رات کو(10 بجے) کے بعد کسی تعلیمی سرگرمی کی اجازت نہیں ہوگی۔

21: گھر کے افراد گھر اور گھر میں موجود ہر شیئ کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔

22: اپنا کام ہر کوئی خود کرے گا، دوسرے پر حکم نہیں جھاڑے گا۔گھر کے سربراہان اپنا کام کسی کو کہہ سکتے ہیں۔

23: خاندان کی ضروریات کسی دوسری ضرورت پر مقدم ہونگی۔

24: کسی کے کمرے یا علیحدگی والی جگہ پر دروازہ کھٹکھٹائے یا اس کی اجازت کے بغیر داخل نہیں ہوگا۔

25: مہمان کے آنے پر خوش اور انہیں خوش آمدید کہا جائے۔

26: مہمان کی خاطر مدارات کی جائے کیوں کہ مہمان کے سامنے پیش کی جانے والی چیزوں کا اللہ کے ہاں حساب نہ ہوگا۔مہمان اپنے ساتھ اللہ کی رحمت لاتا ہے۔

اس مضمون کو اہمیت دیں کیوں کہ اولاد کی تربیت ایک مشکل کام ہے جسے ہفتے کے سات دن اور دن کے چوبیس گھنٹے کرنا ہے۔اس کے علاوہ اگر اولاد کو قرآن کی سورہ نبا، سورۂ واقعہ، سورۂ یس اور سورۂ کہف حفظ کرادیں تو آپ ان کی طرف سے بے فکر ہوسکتے ہیں۔

فقہ وفتاویٰ

آپ کے شرعی مسائل

از: مفتی محمد ندیم الدین قاسمی*

میت کے اوپر آیت کریمہ لکھی ہوئی چادر ڈالنا

سوال: آج کل میت کے اوپر آیت کریمہ لکھی ہوئی چادر ڈالنے کا رواج عام ہوتے جارہا ہے، تو کیا یہ شرعاً درست ہے؟

جواب: میت پر ایسی چادر ڈالنا جس پر آیات قرآنیہ یا کلمۂ شہادت وغیرہ لکھا ہوا ہو، مکروہ اور ممنوع ہے، اور اس غلط رواج کو معاشرہ سے ختم کرنا ضروری ہے۔ (فتاویٰ قاسمیہ، ۳/ ۳۸)

قبر پر ٹھہر کر دعا مانگنا

سوال: کفن دفن کی ساری کاروائیوں سے فارغ ہونے کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا کیسا ہے؟ یا تنہا کسی میت کے قبر پر ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا کیسا ہے؟

جواب: قبر پر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا حدیث سے ثابت ہے، لیکن بہتر ہے کہ قبر سے رخ بدل دے؛ تاکہ عوام کا عقیدہ خراب نہ ہو۔ (فتاویٰ قاسمیہ، ۳/ ۴۸)

ولادت کے بعد بچے کو دیکھنے آنا اور پیسے دینا

سوال: بچے کی ولادت کے بعد دیکھنے آنا اور کچھ رقم ہدیہ دینا، شریعت اسلامی میں اس کی کچھ اصل ہے؟

جواب: بچے کی ولادت کے بعد دیکھنے آنا اور کچھ رقم دینے کو ضروری سمجھنا شریعت اسلامی میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے، ہاں اگر کوئی شخص برضا ورغبت کچھ رقم یا کوئی چیز بطور ہدیہ دیدے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، کیوں کہ انسان اس عمل کو عرف وعادت کی بنا پر کرتا ہے، نہ کہ عبادت کے طور پر۔ (محقق ومدلل جدید مسائل، ۱/ ۱۰۴)

باپ کا بیٹی کو سامان جہیز دینا

سوال: رخصتی کے وقت باپ اپنی بیٹی کو سامان جہیز دیتا ہے تو کیا یہ دینا درست ہے؟

جواب: باپ اپنی بیٹی کو اپنی وسعت کے بقدر بطور تحفہ کے جو جہیز دیتا ہے یہ جائز اور مستحسن ہے لیکن لڑکا

---

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

مطالبہ کرے کہ اگر فلاں فلاں چیز دیں تو میں آپ کی لڑکی سے نکاح کروں گا اور اس پر لڑکی کے باپ کو مجبور کرے تو یہ شرعاً ناجائز اور حرام ہے، اور مردانیت سے گرا ہوا عمل ہے۔ (محقق ومدلل جدید مسائل، ۱/۲۸۱)

بیوی کو خون دینا

سوال: کیا بیوی کو خون دینے سے نکاح میں کوئی نقص آتا ہے؟

جواب: بیوی کو خون دینے سے نکاح میں کوئی نقص نہیں آتا اور جس عورت کو نکاح سے پہلے خون دیا ہو اس سے بھی نکاح جائز ہے، کیوں کہ خون دینے سے حرمتِ مصاہرت ثابت نہیں ہوتی۔ (محقق ومدلل جدید مسائل، ۱/۳۰۲)

خریدتے وقت چیزیں چکھنا

سوال: خریدنے کے وقت چیزیں چکھنا کیسا ہے؟

جواب: کھانے کی چیزیں، آم، خربوز، تربوز وغیرہ چکھنے کی تین صورتیں ہیں: ۱۔ خریدنے کا ارادہ نہ ہو تو منع اور مکروہ ہے، نقصان کا بدلہ دے۔ ۲۔ خریدنے کا عزم تھا چکھنے کی بعد پسند بھی آئی پھر ارادہ بدل گیا تو نقصان کا بدلہ دے یا مالک سے معافی چاہے۔ ۳۔ چکھنے کے بعد پسند نہ آئے تو نہ خریدنے میں کوئی حرج نہیں۔

(محقق ومدلل جدید مسائل، ۱/۳۲۲)

کیا ماہِ صفر منحوس ہے؟

سوال: اکثر حضرات صفر کے مہینہ کو منحوس سمجھتے ہیں، اور اس میں نکاح کرنے کو منع کرتے ہیں، تو کیا یہ صحیح ہے؟

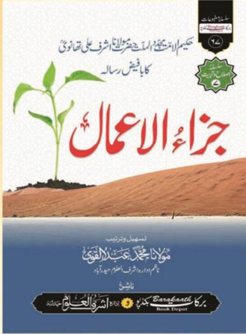
جواب: صفر کے مہینہ کو برا سمجھنا اور اس میں نکاح وغیرہ سے رکنا اس وجہ سے کہ یہ مہینہ اچھا نہیں ہے، یہ جاہلیت والا عقیدہ ہے، اس سے بچنا لازم ہے۔ (کتاب النوازل: ۱/۳۷۵)

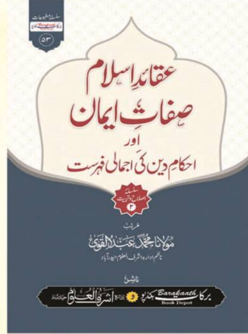
حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز جنازہ

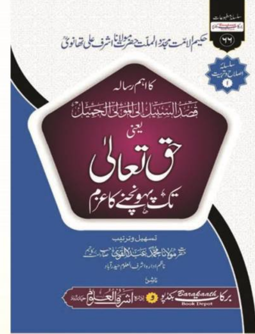
سوال: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز جنازہ ہوئی تھی یا نہیں؟ اور کس نے پڑھائی؟

جواب: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز جنازہ عام دستور کے مطابق جماعت کے ساتھ نہیں ہوئی، اور نہ اس میں کوئی امام بنا، ابن اسحاق وغیرہ اہل سیر نے لکھا کہ تجہیز وتکفین کے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جنازہ، حجرۂ شریف رکھا گیا پہلے مردوں نے گروہ در گروہ نماز پڑھی، پھر عورتوں نے پھر بچوں نے۔ علامہ سہیلی رحمہ اللہ (الروض الانیف ص: ۲/۳۷۷) میں لکھتے ہیں کہ یہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خصوصیت تھی، اور ایسا آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے ہی ہو سکتا ہے، ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی وصیت فرمائی تھی۔ (آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۱/۱۸۹، ۱۹۰)

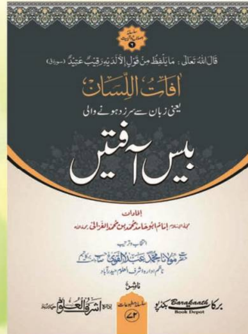
ASHRAFUL JARAID MONTHLY Rs20/-
RNI No: APURD/2007/24089 Postal. No: HSE/884/23-25
Date of Publication 3rd Aug-24, date of Posting 5th Aug-24

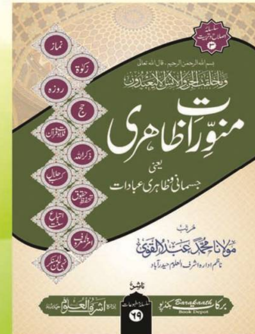


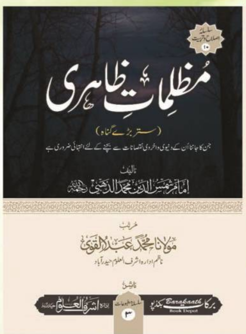


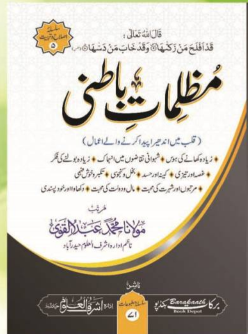


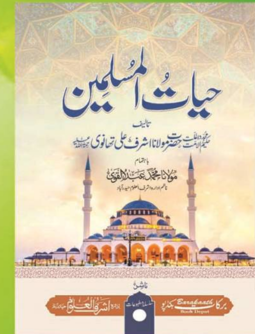












Printer, Publisher & Owner: Mohd Abdul Qavi, # 17-1-391/2, Khaja Bagh, Sayeedabad Colony, Hyderabad- 500059
Published from: # 17-1-391/2, Khaja Bagh, Sayeedabad Colony, Hyderabad- 500059
Editor : Mohammed Abdul Qavi. Printed at: Aish Offset Printers, Cellar Masjid-e-Meraj, Sayeedabad, Hyd-59